# تسلّی کا پیغام

# بیماروں کے نام

بدیع الزمان سعید نورسیؒ

Barla
PUBLICATIONS

جملہ حقوق بحق بارلا پبلیکیشنز محفوظ ہیں

نام کتاب : تسلّی کا پیغام : بیماروں کے نام

طبع اوّل : 2019ء

قیمت : —— ₹

**ترجمہ، تصحیح ومعاونت**

• ثناءاللہ شاہد • محمد عثمان اجمل • مصطفیٰ کچمز • افضل حسین • عبدالرحمٰن آراس

• جمیل اُزترک • صالح سونمز • محمود آراس • منیر توران

**پروف ریڈنگ**

• مصطفیٰ کچمز • محمد عثمان اجمل

Published by ناشر

Barla PUBLICATIONS

A/1 4225 انصار روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002
آفس فون: +91-11-41513533
ای میل: info@barlapublications.com
ویب سائٹ: http://www.barlapublications.com

# فہرست


| | |
|---|---|
| تعارف: سعید نورسیؒ اور رسائل نور | 5 |
| تعلیم وتربیت | 5 |
| وفات | 7 |
| تصانیف | 8 |
| رسائلِ نور کا ظہور | 8 |
| اسلوبِ نگارش | 9 |
| رسائل نور میں کیا ہے؟ | 10 |
| رسائلِ نور کا کردار | 11 |
| پچیسواں لمعہ: پچیس دعاؤں پر مشتمل ہے | 13 |
| پہلی دوا | 13 |
| دُوسری دوا | 14 |
| تیسری دوا | 14 |
| چوتھی دوا | 15 |
| پانچویں دوا | 16 |
| چھٹی دوا | 18 |
| ساتویں دوا | 19 |
| آٹھویں دوا | 20 |

| | |
|---|---|
| نویں دوا | 21 |
| دسویں دوا | 22 |
| گیارہویں دوا | 23 |
| بارہویں دوا | 24 |
| تیرہویں دوا | 25 |
| چودہویں دوا | 26 |
| پندرہویں دوا | 27 |
| سولہویں دوا | 28 |
| سترہویں دوا | 29 |
| اٹھارہویں دوا | 30 |
| انیسویں دوا | 32 |
| بیسویں دوا | 34 |
| اکیسویں دوا | 35 |
| بائیسویں دوا | 36 |
| تئیسویں دوا | 37 |
| چوبیسویں دوا | 37 |
| پچیسویں دوا | 38 |
| سترہواں مکتوب: بچوں کی تعزیت کے بارے میں | 40 |
| دوسرا لمعہ | 45 |
| خاتمہ | 56 |

# سعید نورسیؒ اور رسائل نور

**بدیع الزمان سعید نورسی**

1877ء کو ترکی میں ''نورس'' نامی بستی میں پیدا ہوئے۔

**تعلیم وتربیت:** ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے علما ومشائخ سے حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عجوبۂ روزگار حافظہ سے نوازا تھا، چنانچہ آپ نے قرآن کریم اور فقہ، نحو، ادب اور لغت جیسی نوے کے قریب بنیادی کتابیں بارہ سال کی عمر میں حفظ کر لیں! ان بے نظیر صلاحیتوں کی وجہ سے ہی انہیں ''بدیع الزمان'' کا لقب دیا گیا۔

ایک مرتبہ جب وہ وان شہر کے گورنر ''طاہر پاشا'' کے محل میں مقیم تھے تو اُن کو اطلاع ہوئی کہ کچھ مقامی اخباروں میں یہ خبر نشر ہوئی کہ برطانوی وزیر برائے نوآبادیات ''گلڈ سٹون'' نے برطانیہ کی قومی اسمبلی کے اجلاس میں ارکانِ اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے یہ ہرزہ سرائی کی ہے کہ ''جب تک مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن موجود ہے ہم ان پر حکومت نہیں کر سکتے ہیں، انہیں محکوم بنانے کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ کہ قرآن کو دنیا سے ختم کر دیا جائے یا پھر کم از کم مسلمانوں کو اس سے لاتعلق کر دیا جائے۔'' اس خبر نے نورسی کو تڑپا کر رکھ دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ''میں دنیا پر واضح کر دوں گا کہ قرآن پاک ایک ایسا روحانی سورج ہے جس کی روشنی نہ کبھی ماند پڑ سکتی ہے اور نہ ہی کبھی اسے بجھایا جا سکتا ہے۔'' چنانچہ آپ نے اپنی ساری زندگی اس یوروپین پروپیگنڈے کی بیخ کنی اور قرآنِ حکیم کے حقائق کو واشگاف کرنے کے لیے وقف کر دی۔

اِس ضمن میں آپ 1907ء میں استنبول آئے اور سلطان عبدالحمید ثانی کو شرقی اناضول میں جامعہ ازہر کی طرز پر ''مدرسة الزھراء'' کے نام سے ایک جامعہ اسلامیہ کھولنے کا مشورہ دیا جس میں نورسی کے نقطۂ نظر کے مطابق علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ جدید سائنس کا حسین امتزاج ہو اور اس طرح وہ اسلام کے حقائق کو نشر کرنے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائے۔

نورسی کہتے ہیں:

''دل کی روشنی اسلامی علوم ہیں اور عقل کی روشنی جدید سائنس ہے، ان دونوں کے تال میل سے حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے اور یوں ایک طالبِ حق کا عزم وارادہ نشو ونما پاتا اور دونوں شہپروں کی مدد سے بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے، ان دونوں کے افتراق سے اسلامی علوم میں تعصب اور سائنسی علوم میں حیلے بہانے اور شبہات دَر آتے ہیں۔''

1911ء میں آپ نے ملک شام کا سفر کیا، وہاں کے علما واساتذہ سے ملاقات کی اور اُن کے اصرار پر دمشق کی جامع مسجد اموی میں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں عربی زبان میں ایک طویل خطبہ دیا جسے لوگوں نے پوری دلجمعی سے سُنا۔ حاضرین میں ایک سو کے قریب علما بھی تھے۔ اس خطبے میں اس سوال کا مکمل جواب موجود ہے کہ:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند  گستاخئ فرشتہ ہماری جناب میں!

آپ کی علمی وراثت میں یہ خطبہ ''خطبۂ شامیہ'' کے نام سے مشہور ہے اور کتابی شکل میں مستقل طور پر مطبوع ہے۔

☆ 1909ء میں انہیں بغاوت کے الزام میں مارشل لا کی عدالت میں لایا گیا، جہاں ان کی آنکھوں کے سامنے پندرہ افراد پھانسی کے پھندوں سے لٹک رہے تھے۔ خورشید پاشا نے جب ان سے پوچھا کہ تم بھی شریعت کا نفاذ چاہتے ہو، تو انہوں نے جواب میں کہا: ''ہاں، میں یہی چاہتا ہوں، لیکن ان لوگوں کی طرح نہیں جو یہ کام بغاوت سے کرنا چاہتے ہیں۔'' اور پھر ایک طویل تقریر کی جس میں ان کا یہ مشہور قول بھی تھا: ''اگر میری ہزار جانیں بھی ہوتیں تو میں انہیں اسلام کے لامتناہی حقائق میں سے ایک حقیقت پر بھی قربان کرنے میں پس وپیش نہ کرتا۔''

☆ اپنے طلبہ اور شاگردوں پر مشتمل رضا کاروں کا ایک دستہ تیار کیا، ان کی قیادت کی اور پہلی جنگ عظیم میں روس کے خلاف مشرقی ترکی کے محاذ قفقاز پر مردانہ وار لڑتے ہوئے زخمی ہوئے اور روس کی قید میں چلے گئے۔ وہاں زارِروس اور روسی فوج کے کمانڈر کی توہین کے سبب انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے محفوظ رہے، اور اڑھائی سال کے بعد قید روس سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

☆ قید سے نکلنے کے بعد وہ 1918ء میں استنبول پہنچے تو وہاں شیخ الاسلام اور ارکان حکومت نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔

☆ استنبول پر اتحادیوں کے عارضی تسلط کے دوران ان کی چالبازیوں سے باخبر کرنے کے لئے انہوں نے 1920ء میں عربی میں ایک کتاب ''خطوات ستّہ'' لکھی۔

☆ 1921ء میں سقوطِ خلافت کے بعد آپ نے سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ کرلیا اور ہمہ تن قرآن وایمان کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ اپنی زندگی کے اس دور کو آپ ''جدید سعید'' کا نام دیتے ہیں۔

☆ 1927ء میں انہیں مغربی اناضول میں ''اسپارٹا'' کی ایک چھوٹی سی بستی ''بارلا'' میں جلاوطن کیا گیا جہاں انہوں نے قید تنہائی اور سخت نظر بندیوں کے آٹھ سال گزارے۔ اس اثنا میں وہ اپنا زیادہ تر وقت فکر وتدبر اور نظر وتعبد میں گزارتے تھے۔ اس جگہ سے آپ نے اپنے مشاہدات اور واردات کو املا کروانا شروع کیا۔ آپ کی ان تحریروں کو ''رسائل نور'' کا نام دیا گیا۔ یہ رسائل بیس سال تک ہاتھوں سے لکھے جاتے رہے اور انہیں خفیہ طریقے سے نقل کر کے تقسیم کیا جاتا رہا، جبکہ اس دور میں تقریباً 25 سال کے عرصہ تک قرآن سمیت کوئی بھی دینی کتاب چھپوانا، کہیں لے جانا اور کسی کو دینا قانوناً جرم تھا۔ تا آنکہ پہلی مرتبہ 1956ء میں پریس کے ذریعے طباعت کا مرحلہ آیا۔

☆ 1935ء میں آپ کو ایک سو بیس طلبہ سمیت قید کر دیا گیا۔

☆ 1936ء میں قسطمونی شہر میں جلاوطن کر دیے گئے۔

☆ 1943ء دنیز لی میں دوسری بار قید ہوئی اور نو ماہ جیل میں رہے۔ اس دوران آپ کو کئی بار زہر بھی دیا گیا، لیکن بفضل خدا سلامت رہے۔

☆ 1947ء میں تیسری مرتبہ آپ کو گرفتار کیا گیا اور ''افیون'' شہر لے جا کر مقدمہ چلایا گیا اور جرم ثابت کئے بغیر بیس ماہ کی قید سنائی گئی۔ آپ کے ساتھ آپ کے بیس طالب علم بھی جیل میں رہے۔

☆ 1949ء میں آپ کو رہا کر کے ''امیر داغ'' میں جلاوطن کر دیا گیا جہاں آپ نے دو سال تک نظر بندی کی زندگی گزاری۔

☆ 1951ء میں آپ پر نقل وحرکت کی پابندی ختم کر دی گئی اور آپ اسکی شہر میں آ گئے۔

**وفات:** آپ نے 25 رمضان 23 مارچ 1960ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

# تصانیف

''بارلا'' میں رسائل نور کی تصنیف شروع کرنے تک آپ مندرجہ ذیل کتابیں لکھ چکے تھے:

(۱) مناظرات، غالباً آپ کی پہلی تصنیف ہے۔

(۲) خطبۂ شامی ہ، دمشق کی جامع مسجد اموی میں کی جانے والی تقریر جو کہ عربی میں ہے۔

(۳) اشارات الإعجاز فی مظان الإیجاز، اعجاز القرآن پر بے نظیر تصنیف۔ اس طرز پر نورسی صاحب مکمل قرآن پاک کی تفسیر ساٹھ جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے، لیکن جنگِ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے مکمل نہ کر سکے۔

(۴) خطواتِ ستّہ۔

یہ تمام کتابیں اپنی جگہ پر اہم ہیں، لیکن جس چیز نے اُن کے پیغام کو ابدی حقیقت سے ہم کنار کیا ہے وہ ہیں ''رسائل نور''، جن کا آغاز 1927ء میں ''بارلا'' میں ہوا۔ اُن کی تعداد 130 ہے۔
آپ کا یہ تمام علمی سرمایہ مجموعے کی شکل میں تیرہ جلدوں میں طبع ہو چکا ہے۔ (1)

# رسائلِ نور کا ظہور

''بارلا'' میں ساڑھے آٹھ سالہ قید تنہائی آپ کی جان تو نہ لے سکی، البتہ یہ ہوا کہ اس قید میں ایک ''نئے سعید'' کا ظہور رہوا، اور اس سے مذہب، سائنس، کلچر، اور حکمت پر مشتمل وہ شاہکار روجود میں آیا جسے ''رسائل نُور'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سعید نورسی اس ضمن میں کہتے ہیں ''...... میں نے اپنا تمام وقت اور ارادہ قرآن کریم کے معانی اور فکر و تدبّر پر خرچ کر دیا۔ اور ''سعید جدید'' کی زندگی گزارنے لگا...... تقدیر مجھے شہر بہ شہر، در بدر پھراتی رہی...... اسی اثنا میں میرے نہاں خانۂ دل سے قرآن کریم نت نئے معانی جنم لیتے رہے...... یہ معانی میں نے اپنے ہمراہ رہنے والے لوگوں کو املا کروا دیے۔ ان رسائل کو ''رسائلِ نور'' کا نام دیا گیا۔ یہ رسائل چونکہ حقیقتاً قرآن کریم کے روشنی والے فیضان سے ابھرتے ہیں، اس لیے ان کا یہ نام میرے وجدان کی گہرائیوں سے نکلا ہے، چنانچہ مجھے اس بات کا یقین اور اطمینان حاصل ہو چکا ہے کہ یہ رسائل

میرے فکر ونظر کا چربہ نہیں، بلکہ یہ وہ الہام الٰہی ہے جس کا فیضان اللہ تعالیٰ نے میرے دل پر نور قرآن کے سر چشمے سے جاری کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں لکھنے والا ہر آدمی ان کی برکات سے مالا مال ہو گیا ہے۔ مجھے اس بات کا مکمل یقین ہے کہ لوگوں کے ایمان کو بچانے کا اب صرف یہی ایک راستہ ہے...... ان رسائل کو نقل ونشر کرنے میں جن ایماندار ہاتھوں نے کام کیا ہے وہ چونکہ بالکل اَن پڑھ تھے اس لیے یہ چیز بھی میرے اس یقین کا سبب بنی کہ اس کام کے پیچھے خدائی ہاتھ کام کر رہا ہے اور یہ سب کچھ اہلِ اسلام کے ایمان کو بچانے کے لیے ہو رہا ہے...... چنانچہ میں نے اپنے دین کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس راہ میں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا بہت ضروری سمجھا۔''

اور یوں یہ رسائل جن کا آغاز بارلا میں 1927ء میں ہوا تھا 1950ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ اس دوران مؤلف کو ایک پل بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، بلکہ وہ ایک جیل سے دوسری جیل اور ایک عدالت سے دوسری عدالت میں منتقل ہوتے رہے......اور یوں اس چوتھائی صدی پر محیط قید و بند کی پُر آشوب زندگی کے دوران ایک سو تیس (130) رسائل تالیف ہوئے۔ انہیں ''رسائل نور'' کا نام دیا گیا، اور یہ 1956ء میں پہلی دفعہ زیور طباعت سے آراستہ ہوئے۔

## اسلوبِ نگارش

رسائل نور کا عام انداز یہ ہے کہ نورسی صاحب ان میں دینی و لادینی، اعتقادی و بے اعتقادی، راہروی و بے راہروی اور یقینی و بے یقینی کے درمیان موازنہ قائم کرتے ہیں اور دونوں راستوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ ایمان کے گہرے مسائل کو چھوٹی چھوٹی عام فہم کہانیوں کی صورت میں حل کرتے ہیں اور اُن میں بسا اوقات اولین مخاطب اپنی ذات کو بناتے ہیں، اور یوں خوبصورت تشبیہوں، تمثیلوں، دل نشین استعاروں اور دلچسپ موازنوں کی روشنی میں حقائق سے پردہ اُٹھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عقیدہ و مذہب سے تعلق رکھنے والے اُن حقائق کو بھی زیر بحث لاتے ہیں جو قبل ازیں صرف کبار علما کے فکر ونظر کا موضوع ہوا کرتے تھے۔ اور اس طرح یہ رسائل ایک ایسے گھاٹ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جہاں سیراب ہونے کے لیے عوام وخواص سبھی چلے آرہے ہیں ...

تشبیہات کے ضمن میں ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ نورسی صاحب قرآنِ کریم کو سورج کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں تو اُس سے اخذ کردہ اپنے مضمون کو اُس کی ایک شعاع کہتے ہیں۔ قرآن کو روشنی کے

ساتھ تشبیہ دیتے ہیں تو اپنے مضمون کو اُس کی ایک کرن کہتے ہیں ۔قرآن کو سمندر سے تشبیہ دیتے ہیں تو اپنے مضمون کو اُس کا ایک قطرہ قرار دیتے ہیں، چنانچہ اُن کے مضامین کے عنوان کچھ اِس طرح کے ہوتے ہیں:

بحرِ توحید کا ایک قطرہ۔۔۔بحرِ قرآن کا ایک بُلبلہ......قرآنی باغات کے ثمرات کا ایک دانہ...... گلستانِ قرآن کا ایک پھول......قرآنی بادِنسیم کا ایک جھونکا......قرآنی رہنمائی کی شعاع کا ایک ذرّہ۔۔۔ خورشیدِ قرآن کے انوار کی ایک شعاع۔۔۔قرآن کے الاؤ کا ایک شعلہ......نجومِ قرآن کے انوار کی ایک روشنی......قرآنی روشنی کی ایک کرن......معرفتِ خداوندی کے نور کا ایک نقطہ......وغیرہ۔

## رسائل نور میں کیا ہے؟

☆ انسان کیا ہے؟ کائنات میں اس کا مقام کیا ہے؟ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اسے دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟
☆ زندگی کیا ہے؟ کہاں سے آئی ہے اور کدھر جائے گی؟
☆ اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے؟
☆ میرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے؟
☆ اس کائنات کو پورے نظم وضبط کے ساتھ کون چلا رہا ہے؟
☆ کیا مذہب اور سائنس آپس میں متضاد ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو ان کو آپس میں کیسے ملایا جاسکتا ہے؟
☆ کیا انسان جسمانی موت کے بعد بالکل ختم ہو جائے گا؟
☆ اگر کہیں دوسری زندگی ہے تو اس کی کیفیت کیا ہے؟
☆ مرنے کے بعد زندہ ہونا کیوں کر ممکن ہے؟
☆ نیچر کیا ہے؟
☆ فرشتے کیا ہیں؟ کیا فرشتوں کا وجود ہے؟
☆ روح کیا ہے؟ کیا جسم کی موت کے بعد یہ بھی مر جاتی ہے؟
☆ تقدیر کیا ہے؟ انسان مجبور ہے یا مختار؟
☆ قرآن انسانی معاشرے میں امن وآشتی کی فضا قائم رکھنے کے لیے کون سی بنیادیں فراہم کرتا ہے؟

☆ موجودات درحقیقت کیا ہیں، انہیں کس نظر سے دیکھنا چاہیے؟

☆ موت کیا ہے؟ اس کا استقبال کیسے کیا جائے؟ مرنے کے بعد لوگ کہاں چلے جاتے ہیں؟ آخرتِ خاک تماشا کیا ہے؟

☆ خیر وشر کیا ہے؟ شیاطین وشرور کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟

☆ ذرّات کی حرکات اوران کے وظائف میں کیا اسرار پنہاں ہیں؟

☆ آدم کو جنّت سے کیوں نکالا گیا؟ اس میں کیا حکمت تھی؟

☆ بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون پالتا ہے؟

☆ انسان اور کائنات کے بارے میں یہ اور ان جیسے بیسیوں حل ناپذیر سوالات ہیں جن کے شافی جوابات رسائلِ نور کے صفحات میں موتیوں کی طرح جابجا بکھرے پڑے ہیں۔

## رسائلِ نور کا کردار

ابھی چند سال پہلے کی بات ہے جب ترکی میں اسلام کی ہر یادگار کو آخری حد تک مٹانے کی سر توڑ کوششیں کی گئی تھیں، قرآن کو سیکھنا سکھانا اور قرآنی خط کا استعمال ممنوع تھا، مسجدیں مرثیہ خواں تھیں کہ نمازی نہ رہے اور ان کے مینارے اذانوں کی دل نشین آواز سے محروم ہو گئے تھے......لیکن اب اُسی ترکی کے گلی کوچوں میں اسلام کا نام گونج رہا ہے، اذان شروع ہونے سے پہلے ہی لوگ مساجد کا رُخ کر لیتے ہیں اور چشمِ زدن میں وہاں کھوے سے کھوا چھلنے لگتا ہے، مدارس میں گہما گہمی ہے اور خواتین میں پردے کا التزام بڑھتا جارہا ہے، ایمان کی رُوح پرور ہوائیں مشامِ جان کو معطّر کررہی ہیں۔ اور پھر وہی اسلام حکومت کے ایوانوں میں ایک مؤثر قوت بن کر اُبھر رہا ہے ...

لیکن کبھی غور کیا کہ یہ کرشمہ کس کے حُسنِ کردار کا ہے؟ اس گلستان کی تزیین وآرائش میں کس کا خون شامل ہے؟ کس کی شبانہ روز محنتوں نے اس کی آبیاری کی ہے؟ کون اپنے خونِ جگر سے اِن کو نہال کرتا رہا ہے؟ ترکی میں یہ جو کایا کلپ روحانی انقلاب آیا ہے وہ سب کو کھلی آنکھوں نظر آرہا ہے، لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اس روحانی انقلاب کے رُوحِ رواں جناب سعید نورسی صاحب کے قلمِ گوہر بار سے نکلے ہوئے رسائل ہیں جنہیں دنیا ''رسائلِ نور'' کے نام سے جانتی ہے۔ جی ہاں، روح کی گہرائیوں میں اُتر جانے والے ان رسائل کے الفاظ وحروف میں جو خلوص ووفا کی جاذبیت پائی

جاتی ہے اُس نے وہاں کے لوگوں کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی ہے۔ غیبی تائید و نصرت کے ساتھ ساتھ اس کی ظاہری وجوہات میں یہ چیز بالکل نمایاں ہے کہ یہ رسائل :

☆ وہاں کے ماحول کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور عہد حاضر کے لوگوں کی ذہنی کشمکش کا حل پیش کرتے ہیں۔

☆ اِن کے حرف حرف سے اخلاص ٹپکتا ہے۔

☆ یہ ہر خاص و عام کے ذہن کو اپیل کرتے ہیں اور اُن کے قلوب و اذہان میں پلنے والے شکوک و شبہات کے تار و پود بکھیر دیتے ہیں۔

☆ یہ انتہائی خوبصورت اور دلنشین اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔

☆ اِن میں عصرِ حاضر کی مادہ پرستانہ ذہنیت سے پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب اور غلط فلسفیانہ افکار سے لگے ہوئے زخموں کے لیے مرہمِ شافی پایا جاتا ہے۔

☆ یہ ایمان و ایقان کے انتہائی گہرے حقائق سے ایسے آسان انداز کے ساتھ پردہ اُٹھاتے ہیں جسے ہر سطح کا انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

☆ اور پھر یہ کہ یہ رسائل تمام بنی نوعِ انسان کو اپنا مخاطب بناتے ہیں، یعنی تمام نوعِ انسانی کے لیے ہیں اور انہیں پڑھ کر ہر آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ :

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے !

رسائل نور کی تاثیر کا ایک اور خوبصورت پہلو جو کہ بلکل واضح ہے، یہ ہے کہ ان کا پڑھنے والا مَن وتُو کے بندھنوں سے کافی حد تک آزاد اور فروعی اور مسلکی اختلافات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خواندگانِ رسائل نور میں چونکہ عقابی رُوح بیدار ہو جاتی ہے اس لیے انہیں اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگتی ہے۔

رسائل نور کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ان کے حلقہ بگوش ہو جانے والے اپنے لیے ''طلاب نور'' کا نام پسند کرتے ہیں۔ اور رسائل نور فرد کے دل میں چونکہ اس بات کا پختہ یقین کر کے بٹھا دیتے ہیں کہ: بنی نوع انسان کی نجات محبت میں ہے، اس لیے طلاب نور جزوی اور فروعی مسائل کے بکھیڑوں کو معرفتِ الٰہی کی آگ میں جھونک کر انسانی محبت کا زادِراہ لیے منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

## پچیسواں لمعہ

# پچیس دعاؤں پر مشتمل ہے

﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ١٥٦ۭ﴾

(البقرہ:١٥٦)

﴿وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ٧٩ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ٨٠۠﴾

(الشعرآء:٧٩۔٨٠)

اس لمعے میں ہم اجمال کے ساتھ پچیس قسم کی ایسی دواؤں کا ذکر کریں گے جن میں بیماروں اور آلام ومصائب سے دو چار لوگوں کے لیے مفید علاج اور حقیقی تسلّی کا سامان پایا جاتا ہے، وہ بیمار وآفت رسیدہ لوگ جو کہ نوعِ انساں کے دسویں حصے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

## پہلی دوا

اے مصیبت زدہ مریض! غم نہ کر اور صبر سے کام لے؛ کیونکہ تمہارا یہ مرض کوئی روگ نہیں بلکہ یہ تو ایک قسم کی دوا ہے؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ عُمر ایک ایسا سرمایہ ہے جو زوال کی زد میں ہے، اس لیے اگر یہ بے ثمر رہا ہو تو ضائع ہو جائے گا۔ اور اگر آرام وسکون اور غفلت کی نذر ہو گیا تو پھر تو فوراً ہی ختم ہو جائے گا۔

بے شک بیماری تمہارے سرمائے میں بہت بڑے منافع کا اضافہ کر کے اسے ثمر آور بنا دیتی ہے اور عمر کے تیز رفتاری سے گزر جانے کے لیے گنجائش نہیں چھوڑتی، چنانچہ یہ عمر کو پکڑ لیتی ہے اور اُسے اُس وقت تک لمبا کر دیتی ہے تا آنکہ وہ اپنا مطلوبہ پھل عطا کر دے۔ پھر اسے ختم ہو جانے کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔

بیماری کے ذریعے عمر کے طویل ہوجانے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہ قول ایک ضربُ المثل کی صورت میں زبان زدعام ہو چکا ہے کہ مصیبت کی گھڑیاں بڑی طویل اور آرام کی گھڑیاں مختصر ہوجاتی ہیں۔

## دُوسری دوا

اے بے صبرے مریض! صبر کرو بلکہ شکر کرو؛ تمہاری یہ بیماری تمہاری عمر کے منٹوں کو گھنٹوں کی عبادت میں تبدیل کرسکتی ہے؛ کیونکہ عبادت کی دو قسمیں ہیں:

ایک ایجابی عبادت اور یہ وہ عبادات ہیں جن کے بارے میں سب جانتے ہیں، جیسے نماز اور دُعا وغیرہ۔

اور دوسری سلبی عبادت اور یہ وہ عبادات ہیں جن میں ایک مصیبت زدہ انسان کو اپنے امراض و مصائب کی وجہ سے اپنے ضعف و عجز کا احساس ہوتا ہے، اور یوں وہ اپنے خالقُ الرّحیم کی پناہ میں آتا ہے اور اُس کے حضور میں آہ وزاری کرتا ہے، چنانچہ اس سے وہ کسی بھی ریاکاری سے پاک خالص عبادت کا مظہر بن جاتا ہے۔

**جی ہاں!** کئی ایک صحیح روایات میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ عمر کا وہ حصہ جو دکھ درد اور بیماری سے دو چار ہوکر گزرا ہو وہ صاحب ایمان آدمی کے لیے ایک قسم کی عبادت کا درجہ اختیار کرجاتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنی اس پریشانی کا اللہ کے حضور شکوہ نہ کرتا ہو۔حتیٰ کہ بعض صابروشاکر مریضوں کی بیماری کا ایک منٹ عبادت کے ایک گھنٹے کا حکم لے لیتا ہے۔اور بعض مردانِ کامل کی بیماری کا ایک منٹ پورے ایک دن کی عبادت کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ جیسے کہ یہ بات بہت سی صحیح روایات اور سچے کشفوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔

اس لیے شکر کرو اور ایسی بیماری کی وجہ سے کوئی حرف شکایت زبان پر مت لاؤ جو تمہاری عمر کے ایک منٹ کو ہزار منٹوں میں تبدیل کردے گی اور یُوں تمہاری عمر کو طویل کرنے کا باعث بنے گی۔

## تیسری دوا

اے کسی چیز کو برداشت نہ کرنے والے مریض! دنیا میں آنے والوں کا مسلسل اسے چھوڑ کر چلے

جانا، جوانوں کا بوڑھے ہوجانا اور زوال وفراق کا شکار ہوتے جانا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انسان اس دنیا میں صرف دادِعیش دینے، لطف اندوز ہونے اور لذت اُٹھانے کے لیے نہیں آیا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ انسان تمام جانداروں سے زیادہ کامل، اعلی اور بہترین نظامِ ترکیبی اور صلاحیتوں سے بہرہ رو ہونے بلکہ ان سب کے لیے سلطان وحکمران کا حکم رکھنے کے باوجود ماضی کی لذتوں کا اور مستقبل کی مصیبتوں کا تصور کرنے کی وجہ سے حیوانات کے مقابلے میں انتہائی فروتر حالت میں، پر مشقت، ناخوشگوار اور بے مزہ زندگی گزارتا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ انسان اس دنیا میں رنج وغم سے پاک اور دل پسند زندگی گزارنے کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ انسان کہ جس کے ہاتھ میں ایک عظیمُ الشان سرمایہ ہے، اس لیے آیا ہے تاکہ وہ یہاں پر ایک دائمی اور ابدی زندگی کے لیے تجارت کرے، اور سرمایہ جو اُس کے ہاتھ میں دیا گیا ہے وہ ہے عُمر۔ پس اگر مرض کا وجود نہ ہوتو صحت وعافیت غفلت پیدا کرتی اور دنیا کو اُس کی نظر میں خوبصورت اور خوشنما بنادیتی، اور اسے آخرت بھلا دیتی اور وہ قبر اور موت کو بھول کر بھی یاد نہ کرتا، اور یوں اپنی عمر کا سرمایہ بے فائدہ ضائع کردیتا۔ لیکن بیماری دفعتاً اُس کی آنکھیں کھول دیتی ہے اور اس کے جسم اور وجود سے کہتی ہے: تُو نہ تو موت سے بچ کر ہمیشہ زندہ رہے گا اور نہ ہی شُتر بے مہار ہے، بلکہ تُو ایک ذمہ دار ہستی ہے، اس لیے اس دھوکے سے باہر آ اور اپنے خالق کو یاد رکھ۔ اپنی قبر کی طرف روانگی کو یاد رکھ اور اس کے لیے تیاری کر۔

پس بیماری اس لحاظ سے ایک ایسا مرشد ہے جو خیر خواہی کرتا ہے، جگاتا ہے اور کبھی دھوکہ نہیں دیتا ہے۔ اس لیے اس جہت کو سامنے رکھ کر بیماری کا شکوہ کرنے کی بجائے اس کا شکریہ ادا کر۔ اور اگر بیماری کچھ زیادہ سخت ہوجائے، تو پھر صبر سے کام لینا بہت ضروری ہے۔

## چوتھی دوا

**اے شکوہ سنج مریض!** تمہارا حق یہ ہے کہ حرفِ شکایت زبان پر لانے کی بجائے شکر کرو اور صبر کا دامن تھامے رکھو؛ کیونکہ تمہارا جسم، تمہارے اعضاء وجوارح اور تمہاری دیگر صلاحیتیں اور قابلیتیں نہ تو تمہاری ملکیت ہیں نہ تم نے انہیں خود بنایا ہے اور نہ ہی دُوسرے کارخانوں سے خریدا ہے۔ تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کسی اور کی ملکیت ہیں، اور مالکُ الملک اپنے ملک میں جیسے چاہے تصرّف کرتا ہے۔

جس طرح ایک نہایت مال دار اور ہنر مند صنعت کار اپنی خوبصورت صنعت گری اور بیش قیمت

دولت وثروت کی تشہیر ونمائش اور ماڈلنگ کے لیے کسی غریب آدمی کو ایک گھنٹے کے لیے تھوڑی بہت اجرت پر اپنی تیار کی ہوئی قیمتی قمیص اور مرصّع قسم کا سوٹ پہنا دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس انواع واقسام کی صنعت گری اس پرطرح طرح کی مینا کاری کرتا ہے، اُسے ایک حالت سے دوسری حالت میں ڈھالتا ہے، اس کی کٹنگ کرتا ہے، اس میں کئی قسم کی تبدیلیاں لاتا ہے اور اُس کے ناپ میں کمی بیشی کرتا ہے۔

اب اُجرت پر کام کرنے والے آدمی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ صنعت کار سے کہے یہ آپ نے مجھے بڑی عجیب صورت حال سے دوچار کر دیا ہے، کبھی آپ کہتے ہیں سیدھے کھڑے ہوجاؤ اور کبھی کہتے ہیں جھک جاؤ، اس سے تو آپ مجھے تھکا رہے اور پریشان کر رہے ہیں اور یہ قمیص جس نے مجھے چار چاند لگا دیے ہیں آپ اُس کی کانٹ چھانٹ کر کے میرے حُسن کو خراب کر رہے ہیں! کیا وہ نادار آدمی اُس صنعت کار کو یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں اور بے انصافی سے کام لے رہے ہیں، جیسے کہ چھبیسویں مقالے میں ذکر کیا گیا ہے؟

بعینہٖ اسی طرح اے بیمار شخص! اُس صانعُ الجلیل نے تمہارے جسم پر جو قمیص پہنائی ہے، وہ سمع و بصر اور عقل وقلب جیسے نورانی حواس کے ذریعے اُس قمیص کی کشیدہ کاری کرتا ہے، اور اپنے اسمائے حسنیٰ کے نقوش کے اِظہار کے لیے تجھے بہت سے حالات کے درمیان گھماتا ہے اور بہت سے اوضاع واطوار سے دوچار کرتا ہے۔

چنانچہ جس طرح تجھے اُس کے اسم ’’الرزاق‘‘ کی پہچان بھوک کے ذریعے ہوتی ہے اسی طرح اس کے اسم گرامی ’’الشافی‘‘ کی پہچان اپنی بیماری کے ذریعے کر لے۔

اس میں شک نہیں کہ آلام ومصائب اسمائے حسنیٰ کی ایک قسم کے احکام کو آشکار کرتے ہیں، اسی بنا پر اُن میں حکمت کی بہت سی کرنیں اور رحمت کی بہت سی شعائیں پائی جاتی ہیں۔ پس اگر پردہ اٹھ جائے تو تجھے اس بیماری کے پس پردہ بہت سے خوبصورت اور پیارے معانی ملیں گے جس بیماری سے تُو وحشت کھا رہا ہے اور نفرت کر رہا ہے۔

## پانچویں دوا

اے بیماری کے ستائے ہوئے لاچار شخص! مجھے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے اس دور میں بیماری اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور اس کی بے پایاں رحمت کی

طرف سے بہترین تحفہ ہے۔

سابقہ آٹھ نو سالوں کے درمیان کئی ایک بیمار نوجوانوں نے مجھ سے ملاقات کر کے اپنے لیے دعا کی استدعا کی ہے، حالانکہ میں اس قابل بھی نہیں ہوں۔ تو میں نے یہ دیکھا کہ ان میں سے جو بیماری کے ہاتھوں زیادہ نڈھال ہے وہ آخرت کو زیادہ یاد کرتا ہے اور اس کے بارے میں زیادہ فکر مند ہے۔ اور جوانی کی غفلت میں بدمست نہیں ہے، بلکہ وہ بیماری کے رنج والم کے باوجود خود پر ڈکسی حد تک ڈ کنٹرول رکھتا ہے۔ اور جوانی کی حیوانی ہوسناکیوں سے خود کو بچا کر رکھتا ہے۔ اور میں ہمیشہ ان کا حوصلہ بڑھاتا اور انہیں اس چیز کا احساس دلاتا تھا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہاری یہ بیماریاں ڈ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تمہاری برداشت سے باہر بھی نہیں ہیں ڈ اللہ تعالیٰ کا ایک احسان اور اس کی طرف سے ہدیہ اور عطیہ ہیں۔ اور میں کہا کرتا تھا:

''میرے بھائی! میں تمہاری اس بیماری کے نہ تو خلاف ہوں اور نہ اس سے چڑتا ہوں۔ میں اس کی وجہ سے نہ تم پر ترس کھاتا ہوں اور نہ دلسوزی کرتا ہوں اور نہ اس وجہ سے تمہارے لیے دعا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ پس تم اپنی اس بیماری میں صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کرو اور تحمل و برداشت کا دامن تھام لو، تاکہ بیماری تمہیں خواب غفلت سے بیدار اور ہوشیار کرے؛ کیونکہ بیماری اپنی ڈیوٹی پر ہے؛ جب اپنی ڈیوٹی ادا کر لے گی خداوند کریم تمہیں شفا عطا کر دے گا۔

میں انہیں یہ بھی کہا کرتا تھا صحت کی خرابی ایک آزمائش ہوتی ہے۔ تمہارے کئی ہم عمر صحت کی خرابی سے جنم لینے والی غفلت میں مدہوش رہنے کی وجہ سے نماز چھوڑ جاتے ہیں اور موت کو بھول جاتے ہیں۔ اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں اور دنیا کی چند لمحوں کی عارضی متاعِ حیات سے لطف اندوز ہونے کے لیے آخرت کی ابدی اور لامتناہی زندگی کی نہ صرف بنیادیں ہلا دیتے ہیں بلکہ اس کے عالیشان محل کو زمیں بوس بھی کر دیتے ہیں۔ جبکہ اس کی وجہ سے تمہیں ایسی آنکھ مل جانی چاہیے جس سے تمہیں وہ قبر نظر آنی شروع ہو جائے جو تمہاری وہ منزل ہے جہاں تمہیں بہر صورت پہنچنا ہے۔ اور اس آنکھ سے اُس منزل سے بعد والی اخروی منزلیں بھی نظر آنی چاہئیں، اور پھر تمہاری حرکات وسکنات ان منزلوں کے مطابق ہونی

چاہئیں۔اس پہلو سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ تمہاری بیماری بیماری نہیں بلکہ تمہارے لیے صحت کا پیغام ہے؛ کیونکہ یہ تمہاری رفتار کنٹرول کرتی ہے۔اور تمہارے وہ ہم عمر جو بظاہر صحت مند نظر آ رہے ہیں،صحت مند نہیں ہیں بلکہ بیمار ہیں۔''

## چھٹی دوا

اے دُکھ درد کا شکوہ کرنے والے مریض! میں تجھ سے تیری عمر کے بارے میں پوچھتا ہوں۔اپنی گزشتہ عمر کو ذرا ذہن میں لاؤ اور اپنے سابقہ لذیذ پُرسکون اور خوشگوار دن،اور دردناک گدلے اوقات کو یاد کرو۔ایسا کرو گے تو یا تو تُم ''واہ'' کہو گے یا ''آہ''! مطلب یہ ہے کہ تمہارا دل یا تمہاری زبان یا تو کہیں گے: ''**الحمدللہ و الشکر لہ**'' اور یا پھر کہیں گے ''ہائے حسرت''،''ہائے افسوس''۔

اب دیکھو،تمہارے سابقہ آلام و مصائب جب تمہارے ذہن میں آئے تو تمہیں ایک معنوی لذت سے سرشار کر گئے،اور ایسے میں تمہارے دل میں ''**الحمدللہ و الشکر لہ**'' کی لہر جاگ اُٹھی؛ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اَلم کا زوال لذت اور فرحت و سرور کا احساس پیدا کرتا ہے۔اور اس لیے بھی کہ یہ آلام و مصائب اپنے زوال کے ساتھ رُوح میں ایک رُوح چھوڑ گئے کہ جب تم تصوّر کرو گے تو رُوح سے لذت بہے گی،اور اِس طرح شکر ٹپکنا شروع ہو جائے گا۔لیکن گزرے ہوئے لذت و سرور کے دن جو کہ اب حسرت اور افسوس کا باعث بن گئے ہیں،وہ دن اپنے زوال کے ساتھ تمہاری روح میں دائمی دکھ درد کا کانٹا بو گئے ہیں،چنانچہ جب تم اُن کا تصوّر کرتے ہو تو وہ دکھ درد تازہ ہو جاتے ہیں اور حسرت و افسوس کے آنسو رُلانے کا باعث بنتے ہیں۔

تو جب ایک دن کی غیر شرعی لذت انسان کو بسا اوقات ایک سال تک کے لیے معنوی دکھ درد سے دو چار کر دیتی ہے،اور ایک دن کی وقتی بیماری کے درد سے حاصل ہونے والے بہت سے دنوں کے ثواب میں ایک معنوی لذت پائی جاتی ہے،مزید یہ کہ اس مرض سے نجات حاصل ہو جانے میں بھی ایک معنوی لذت پائی جاتی ہے؛تو پھر ذرا اپنے اوپر نازل ہونے والی اس وقتی بیماری کے نتیجے پر غور کرو اور اس میں پائے جانے والے ثواب کا تصوّر کرو،اور کہہ دو:

اے میری جان! یہ بیماری بھی گزر ہی جائے گی۔اور شکوہ شکایت کی بجائے شکر کا رویہ اختیار کرو۔

## چھٹی دوا[1]

دنیا کی لذتوں اور ذائقوں کو یاد کر کے مرض کے ہاتھوں پریشان ہونے والے بھائی! اگر یہ دنیا دائمی ہوتی اور ہمارے راستے میں موت نہ ہوتی اور زوال وفراق کی ہوائیں نہ چلتیں اور تند و تیز اور شدید مستقبل میں معنوی سردی کا موسم نہ ہوتا، تو میں بھی تمہارا ساتھ دیتا اور تمہاری اس حالت پر دُکھی اور پریشان ہوتا۔ لیکن دنیا جب ہمیں ایک دن یہ کہہ دے گی کہ مجھے الوداع کہنے کے لیے دروازے کی طرف آؤ۔ اور ہماری چیخ وپکار پر کان نہیں دھرے گی، تو پھر قبل اس کے کہ یہ ہمیں دروازے کی طرف دھکیل دے، ہمیں ابھی سے ڈاِس بیماری کے انتباہ پر ڈاس کے عشق سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔

**جی ہاں!** بیماری ہمیں یہ لطیف معنی یاد دلاتی ہے اور کہتی ہے کہ تمہارا یہ جسم پتھر یا لوہے کا نہیں ہے بلکہ یہ چند ایسے مختلف مادوں سے مرکب ہے جس میں ہمیشہ بکھرنے اور پراگندہ ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس لیے خود فریبی سے باہر آؤ اور اپنی عجز و درماندگی کو سمجھ جاؤ اور اپنے مالک کو پہچانو اور اپنی ذمہ داری کو جانو اور اپنے دنیا میں آنے کا مقصد سمجھو۔ بیماری اپنی یہ یاددہانی انتہائی مخفی طریقے سے دل کے کان میں پھونکتی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ دنیا کے ذائقے اور اس کی لذت کو جب دوام نہیں ہے۔ اور خاص کر اُس وقت کہ جب ذائقہ اور لذت غیر شرعی ہو۔ اور یہ چیز عارضی ہونے کے ساتھ ساتھ آلام وذنوب کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس لیے بیماری کی وجہ سے اس ذائقے اور اس لذت سے محروم ہو جانے کی وجہ سے رونے دھونے سے ہاتھ اٹھاؤ اور بیماری میں حاصل ہونے والے اُخروی ثواب اور معنوی عبادت پر دھیان دو اور اس خالص ذائقے کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

## ساتویں دوا

صحت کی لذت سے محروم ہونے والے مریض! تمہاری یہ بیماری صحت میں پائی جانے والی نعمتِ

---

[1] یہ لمعہ چونکہ دل پر فطری صورت میں وارد ہوا ہے، اس لیے چھٹے مرتبے میں دو دوائیں لکھی گئیں، بنا بریں ہم نے اسے اپنی حالت پر رہنے دیا، تاکہ اس کی فطری صورت میں کوئی خلل نہ آئے۔ درحقیقت یہ سوچ کر ہم نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی کہ شاید اس میں کوئی راز پوشیدہ ہو۔ (مؤلف)

الٰہیہ کو ختم نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس وہ تمہیں اس کے ذائقے سے آشنا کرتی ہے اوراس کے لطف کو دوبالا کرتی ہے؛ اُس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی چیز جب دوام اختیار کرتی ہے اپنی تاثیر کھودیتی ہے۔ اور یہ بات اتنی مسلّم ہے کہ اہلِ حقیقت بالاتفاق کہتے ہیں'' اِنَّمَا الْأَشْيَاءُ تُعْرَفُ بِأَضْدَادِهَا۔'' یعنی ہر چیز کی پہچان اس کی ضد سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اندھیرا نہ ہوتا تو روشنی کی پہچان نہ ہوتی اور روشنی بے لطف رہتی۔ ٹھنڈ نہ ہوتی تو حرارت کی پہچان نہ ہوتی اور حرارت بے مزا رہتی۔ اگر بھوک نہ ہوتی تو کھانا کچھ مزا نہ دیتا۔ معدے کی حرارت نہ ہوتی تو پانی پینے سے کوئی لذت نہ ملتی۔ علّت نہ ہوتی تو عافیت بے ذائقہ ہوتی۔ اور اگر بیماری نہ ہوتی تو صحت بالکل بے لذت ہوتی۔

فاطرُ الحکیم کا انسان کو بہت سے آلات وادوات سے اس طرح نواز دینا کہ ان کے ذریعے کائنات میں پائی جانے والی انواع واقسام کی محدود نعمتوں کی پہچان کرے اوران سے لطف اندوز ہو، چیز اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسان کو اپنے ہر طرح کے احسان سے آگاہی دینا چاہتا ہے، اسے اپنی ہر نعمت سے لطف اندوز کرنا چاہتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان ہمیشہ اس کا شکر گزار رہے۔ تب اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح صحت وعافیت عطا کی ہے اُسی طرح وہ بیماریاں، دُکھ تکلیفیں اور آزمائشیں عطا کرتا ہے۔

اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ اگر تمہارے سر میں، یا ہاتھ میں یا معدے میں یہ بیماری نہ ہوتو وہ لذیذ اور خوشگوار نعمتِ الٰہی جو اِن میں اِن کی صحت کی حالت میں پائی جاتی ہے، تمہیں اس نعمت کا احساس ہوتا اور تم اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے؟ ہرگز نہیں، شکر تو رہا ایک طرف تم اس کا ذکر تک بھی نہ کرتے۔ اور اس صحت کو لاشعوری طور پر غفلت میں بلکہ سفاہت وحماقت میں صرف کر دیتے۔

## آٹھویں دوا

اے اپنی آخرت کو یاد کرنے والے مریض! بے شک بیماری گناہوں کی میل کچیل کو دھو کر انسان کو پاک صاف کر دیتی ہے۔ صحیح حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ بیماریاں گناہوں کا کفّارہ ہیں۔ اسی طرح ایک حدیث میں کچھ اس طرح بھی آیا ہے: ''ایک بیمار مومن آدمی کی کپکپاہٹ گناہوں کو ایسے جھاڑ دیتی ہے جیسے درخت کو ہلانے سے اس کے پکے ہوئے پھل گر جاتے ہیں''۔ اور گناہ جہاں ابدی زندگی میں دائمی امراض کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں اس دنیا میں وہ قلب و وجدان وروح کے لیے معنوی امراض

ہیں۔اورتم اگر بیماری پر صبر کرو گے اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لاؤ گے تو اس وقتی بیماری کی وجہ سے بہت سی دائمی بیماریوں سے نجات پا جاؤ گے۔اور اگر تم گناہوں کو یاد نہیں کرو گے،آخرت کو بھولے رہو گے، یا اللہ تعالیٰ سے بے خبر رہو گے تو پھر یہ سمجھو کہ تم اس موجودہ بیماری سے لاکھوں درجے زیادہ ہولناک بیماری میں مبتلا ہو، پس اُس سے بھاگو اور فریاد کرو؛ کیونکہ تمہارے قلب و روح و نفس کا تمام موجوداتِ عالم کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس صورت میں یہ تمام تعلقات زوال و فراق کے سبب ٹوٹتے رہتے ہیں اور تمہارے اندر لاتعداد زخم چھوڑ جاتے ہیں۔اور خاص کر ایسی حالت میں کہ جب تمہیں آخرت کے بارے میں علم نہ ہو اور تم موت کو ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جانا سمجھتے ہو! گویا کہ تم ایک ایسے مریض بدن کے مالک ہو جو اس دنیا کے برابر زخموں سے بھرا ہوا ہے۔

اب ایسی صورت میں تمہارے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تم سب سے پہلے اپنا اعتقاد ٹھیک کرو اور اپنے اُس معنوی جسم کے لیے مکمل علاج اور حقیقی شفا تلاش کرو جسے لاتعداد امراض اور غیر محدود زخم برباد کیے جا رہے ہیں۔اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ علاج تمہیں صرف ایمان کے شافی تریاق اور شفا بخش علاج سے ہی مل سکتا ہے۔اور یاد رکھو کہ اس علاج تک پہنچنے کا ایک مختصر ترین راستہ ہے کہ غفلت کے پردے کے پیچھے چھپے ہوئے اپنے اُس عجز و فقر کی کھڑکیوں سے اُس قدیرِ ذوالجلال کی قدرت اور اُس کی رحمت کی پہچان کرو جس عجز و فقر کا چہرہ تمہیں اس مادی بیماری نے غفلت کے پردے کو چاک کر کے دکھایا ہے۔

**جی ہاں!** جو شخص اللہ کو نہیں پہچانتا ہے وہ اپنے سر پر دُنیا و ما فیہا کے برابر ہموم و غموم اور مصیبتیں اُٹھائے پھرتا ہے۔لیکن جسے اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اس کی قوّتِ ایمان کا ذریعے ایمان کے درجے کے مطابق ہوتا ہے، اور یُوں مادی بیماریوں کی جزوی تکلیف اِس ایمان سے جنم لینے والے سرور و شفا اور معنوی لذت کے باعث مضمحل ہو کر زائل ہو جاتی ہے۔

## نویں دوا

اے اپنے خالق کی پہچان رکھنے والے مریض! بیماریوں میں جو خوف و وحشت والم پایا جاتا ہے، وہ صرف اس لیے ہے کہ بیماری بسا اوقات موت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔اسی لیے تو ایسی بیماریاں خوف و

ہراس میں مبتلا کرتی اور احتیاطی تدابیر کا تقاضا کرتی ہیں جو ممکنہ طور پر موت کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔

**اوّلاً:** تو یہ بات سمجھیں کہ اجل مقدّر ہے تبدیل نہیں ہوتی، چنانچہ شدید قسم کے جاں بلب مریضوں پر رونے والے کئی صحیح سالم لوگ موت کے منہ میں چلے گئے اور مریض صحت یاب ہوئے اور بعد میں زندہ بھی رہے۔

ثانیاً یہ کہ موت اتنی ہولناک نہیں ہے جتنی کہ صورت شکل سے نظر آتی ہے۔ ہم نے قرآن کی عطا کردہ روشنی سے کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر قطعی طریقے سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے موت خدمتِ حیات سے سبکدوشی، اور دنیا کے میدان میں آزمائش پر مبنی تعلیم وتدریب نام کی عبودیت سے موقوفی یا برطرفی کا نام ہے، اور اپنے اُن ننانوے فیصد احباب واقارب کے ساتھ ملنے کا نام ہے جو عالمِ آخرت میں جا بسے ہیں، اور اُن کے اپنے وطنِ حقیقی اور اپنی سعادتِ ابدی کے مقام میں داخل ہونے کا نام ہے، اور دنیا کے قید خانے سے نکل کر جنتوں کے باغات کی طرف آنے کی دعوت ہے، اور خالقِ رحیم کے فضل وکرم سے اپنی خدمات کی اُجرت لینے کی باری کا نام ہے۔

موت کی ماہیت حقیقت کی نظر میں جب یہی ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اُس کی طرف گھبراہٹ کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس نظر سے دیکھا جائے کہ یہ رحمت وسعادت کا پیش خیمہ ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ بعض اولیاء اللہ نے جو موت سے خوف کا اِظہار کیا ہے تو اُس کی ہولنا کی سے نہیں بلکہ اس بنا پر کیا ہے کہ وظیفۂ حیات کے دوام سے چونکہ نیکیاں کمانے کا سلسلہ چلتا رہتا ہے اس لیے انہیں مزید نیکیاں کمانے کا لالچ ہوتا ہے۔ جی ہاں! موت اہلِ ایمان کے لیے رحمت کا دروازہ اور اہلِ ضلالت کے لیے ابدی ظلمات کا کنواں ہے۔

## دسویں دوا

اے غیر ضروری طور پر پریشان ہونے والے مریض! تم مرض کے بوجھ سے غمگین ہو، اور یہ غم تمہارے مرض کو مزید بوجھل کر رہا ہے۔ اور اگر اس بیماری کو کچھ ہلکا کرنا چاہتے ہو تو غم کو چھوڑنے کی کوشش کرو۔ مطلب یہ ہے کہ بیماری کے فوائد اس کا ثواب اور اس کے بسرعت گزر جانے کے بارے میں سوچو، اور یوں غم کو زائل کرو اور بیماری کے خوف کا قلع قمع کردو۔

**جی ہاں!** بے شک غم بیماری کو دوگنا کر دیتا ہے اور تمہارے دل میں اس مادی بیماری کے پردے میں معنوی بیماری کا باعث بنتا ہے، اور یوں یہ مادی بیماری اس معنوی بیماری کا سہارا لے کر دوام اختیار کر جاتی ہے۔ لیکن اگر تسلیم و رضا کے سبب اور بیماری کی حکمت کو یاد کرنے سے غم زائل ہو جائے تو مادی بیماری کی اہم جڑیں کٹ جاتی ہیں، بیماری ہلکی ہو جاتی ہے اور اس کا کچھ حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایک معمولی سی بیماری کے ساتھ جب اوہام و افکار لگ جائیں تو وہ غم و اضطراب کی وجہ سے دس گنا تک بڑھ جاتی ہے، لیکن غم و اضطراب کے ختم ہونے پر بیماری دس میں سے نو حصے ختم ہو جاتی ہے۔

غم و اضطراب جہاں مرض میں اضافے کا باعث بنتے ہیں وہاں یہ حکمتِ الٰہیہ پر ایک طرح کا الزام اور رحمتِ الٰہیہ پر تنقید اور خالقُ الرحیم کے خلاف شکایت بھی ہے، چنانچہ اس بنا پر مریض اپنے ارادے کے برعکس ایک تادیبی طمانچہ کھاتا ہے۔

جی ہاں! جس طرح شکر نعمت میں اضافے کا باعث بنتا ہے، اسی طرح شکوہ، شکایت بیماری اور مصیبت میں اضافہ کرتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ غم و اضطراب بذاتِ خود ایک بیماری ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ بیماری میں پائی جانے والی حکمت کی پہچان کا علم ہو جائے گا تو پھر غم و اضطراب پر ڈعلم و حکمت کی ڈبیہ مرہم رکھ دیں، اور بیماری سے نجات پا جائیں اور ''آہ'' کی بجائے ''واہ'' کہیں۔ اور ''ہائے افسوس'' کی بجائے کہیں: **الحمد للہ علی کل حال۔**

## گیارہویں دوا

اے میرے بے چین مریض بھائی!

بے شک بیماری تمہیں تمہاری بیماری کے پہلے دن سے لے کر آج کے دن تک موجودہ درد و الم کا نظارہ کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے میں پائے جانے والے ثواب کی صورت میں ایک روحانی لذت اور زائل ہو جانے کی صورت میں ایک معنوی لذت سے آشنا کرتی ہے۔ اور اس دن کے بعد بلکہ اس گھڑی کے بعد بیماری معدوم ہو جائے گی۔ اور معدوم چیز کا یقیناً کوئی دَرد و الم نہیں ہوتا ہے۔ اور جب درد نہیں ہو گا تو اس سے متاثر ہونا اور بے چینی و بے کلی کا اظہار کرنا بھی بے معنی ہو گا۔ آپ چونکہ بیماری کے وہم میں مبتلا ہونے کی غلطی کرتے ہیں اس لیے یہ وہم آپ کو بے چینی سے دوچار کر دیتا ہے؛ کیونکہ آج کے دن سے پہلے کی مادی بیماری کی مدت کے بیت جانے کے ساتھ ہی اس مدت کا درد و الم بھی بیت گیا اور اس

کے بدلے میں ملنے والا ثواب اور بیماری کے ختم ہو جانے کی لذت باقی رہ گئی۔ اب ٹھہرا کہ یہ صورتِ حال آپ کو فرح وسرور بخشے، اس لیے اب سابقہ بیماری اور اس سے متعلقہ دُکھ درد کا تصوّر کر کے دُکھی اور بے چین ہونا پاگل پن ہے۔ اور مستقبل ابھی آیا ہی نہیں کہ اُن کے بارے میں کسی غیر موجود دن میں غیر موجود بیماری سے حاصل ہونے والے غیر موجود درد والم کے وہم سے فکر شروع کر دیا جائے تو اب عدم کے ان تین مرتبوں کو دکھ کا احساس کر کے اور جزع فزع کا اظہار کر کے وجود کا رنگ دے دینا پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟

اس گھڑی سے پہلے والے بیماری کے اوقات اگر فرح وسرور بخشتے ہیں اور اس گھڑی کے بعد میں آنے والا وقت ابھی معدوم ہے اور اس میں بیماری کا وجود بھی معدوم ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو صبر کی قوت عطا کی ہے اُسے اس طرح اِدھر اُدھر پراگندہ نہ کرو بلکہ اُسے موجودہ لمحات میں محسوس ہونے والے دکھ درد کے مقابلے میں یکجا کرو اور کہو: ''یاصبور'' اور اس پر توکل کرو۔

## بارہویں دوا

بیماری کی وجہ سے اپنی عبادت اور اوراد و اذکار سے محروم ہو جانے والے اور اس محرومی پر غمگین ہونے والے مریض! یاد رکھو کہ صحیح حدیث کی رو سے یہ بات ثابت ہے کہ ایک تقویٰ شعار مومن آدمی بیماری کے دنوں میں بھی اپنے اُس دائمی ورد کا ثواب پا لیتا ہے جسے وہ بیماری کی حالت میں ادا نہیں کر سکا۔ پس ایک مریض آدمی جو کہ کسی بوجھل بیماری کی حالت میں بقدر استطاعت صرف فرائض ہی کو ادا کرتا رہے، تو اس کی وہ بیماری اخلاص کے ساتھ ادا کی جانے والی سنتوں کے قائم مقام ہو جائے گی۔ اور یہ اِس لیے ہے کہ وہ مریض صبر وتوکل سے مزیّن ہے اور فرائض کو باقاعدگی سے ادا کرتا ہے۔ اسی طرح بیماری انسان کو اس میں پائی جانے والی عجز و درماندگی اور ناتوانی کا شعور دیتی ہے اور اُسے عجز و ناتوانی کی حالی و قالی زبان کے ساتھ دُعا مانگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو لامحدود عجز و درماندگی اور لاانتہا کمزوری رکھ دی ہے، اس لیے ہے کہ وہ ہمیشہ اُسے پکارتا رہے، اس کے آگے آہ وزاری کرتا رہے اور اس کے دروازے کی پناہ ڈھونڈتا رہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاۤؤُكُمْ﴾ میں پائے جانے والے راز کی رُو سے بیماری اس خالص دعا اور گریہ زاری کا سبب بنتی ہے جو کہ انسان کی اصل قیمت اور اس کی تخلیق میں مضمر حکمت کا سبب ہے۔

بنا بریں، اس جہت سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان بیماری کی وجہ سے حرف شکایت زبان پر لانے کی بجائے اللہ کا شکر ادا کرے اور صحت یاب ہو کر دعا کے اُن سرچشموں کو بند نہ کرے جو بیماری نے جاری کیے ہیں۔

## تیرہویں دوا

اے بیماری کا شکوہ کرنے والے مصیبت زدہ انسان! بے شک بیماری بعض لوگوں کے لیے ایک اہم دفینہ اور ایک بیش قیمت اِلٰہی تحفہ ہے، پس ہر بیمار شخص اپنی بیماری کے بارے میں یہی بات تصوّر کر سکتا ہے۔

اجل کا وقت جو غیر معیّن ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو مطلق نا اُمیدی اور مطلق غفلت سے بچانے کے لیے اور خوف و رجا کے درمیان ٹھہرانے اور دنیا و آخرت کو محفوظ رکھنے والے مرکز میں رکھنے کے لیے اپنی حکمت کے تحت اَجل کو پس پردہ رکھا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اَجل کا آنا ہر وقت ممکن ہے، چنانچہ اگر وہ انسان کو غفلت کی حالت میں آ پکڑے تو اس بات کا احتمال ہے کہ وہ اُس کی ابدی زندگی کو بہت زیادہ نقصان پہنچا دے گی۔ پس بیماری اس غفلت کو پراگندہ کر دیتی ہے، آخرت کے بارے میں فکر مند کرتی ہے اور موت کی یاد دلاتی ہے اور انسان تیاری میں لگا رہتا ہے۔ اس چیز کا فائدہ بسا اوقات اس قدر ہوتا ہے کہ انسان بیس دنوں میں اتنی کامیابی حاصل کر لیتا ہے کہ بیس سال میں بھی نہیں کر سکتا۔

مثال کے طور پر: ہمارے ملنے والوں میں سے دو نوجوان تھے رحمہا اللہ ان میں سے ایک کا نام ''صبری'' تھا جس کا تعلق ''ایلاما'' نامی گاؤں سے تھا اور دوسرے کا نام ''مصطفی وزیر زادہ'' تھا جو کہ ''اِسلام کاپی'' نامی گاؤں سے تھا۔ میرے شاگردوں میں یہ دونوں آدمی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے، لیکن میں ایمانی خدمت کے سلسلے میں اُن کی پُرخلوص کاوشیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ اور اس چیز کی حکمت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لیکن اُن کے فوت ہو جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ وہ دونوں کسی مہلک بیماری میں مبتلا تھے اور اُس بیماری کی رہنمائی کی روشنی میں دوسرے فرائض تک سے کوتاہی برتنے والے غافل نوجوانوں کے برعکس عظیمُ الشان تقوی، پایدار خدمت اور آخرت میں نفع دینے والی بہترین وضع قطع پر فائز ہو گئے۔ اور ان کی بیماری کی دو سال کی محنت مشقت ان کی ابدی سعادت مندی کی زندگی کا وسیلہ بن گئی۔ ان شاء اللہ۔

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ میں جو کبھی کبھار ان کی صحت کے لیے دعا کیا کرتا تھا، دنیاوی نقطۂ نظر سے میری وہ دعا ان کے لیے بددعا بن گئی تھی۔ لیکن اُمید ہے کہ میری وہ دعا اُن کی اخروی صحت کے لیے قبول ہوگئی ہے۔ ان شاء اللہ۔

تو یہ دونوں آدمی ڈ میرے اعتقاد کے مطابق ڈ اتنا فائدہ اُٹھا گئے جو دس سالہ تقویٰ شعاری سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ دونوں بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنی صحت و جوانی پر بھروسا کیے رہتے اور خود کو غفلت اور گناہ کی گود میں گرادیتے ڈ جبکہ موت ان کی گھات میں تھی، اور وہ انہیں ان کی گناہ آلودہ زندگی میں جا پکڑتی ڈ تو وہ اپنے قبروں کو روشنیوں کے اس دفینے کی بجائے بچھوؤں اور سانپوں کے گھروندے بنا کر جاتے۔

بیماری کے جب بہت سے فائدے ہیں تو پھر یہ ضروری ہے کہ انسان اس کی شکایت نہ کرے بلکہ اُس پر صبر و توکل کے ساتھ شکر بجالائے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر مکمل بھروسا رکھے۔

## چودہویں دوا

اے وہ مریض کہ جس کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے! اگر تمہیں معلوم ہو جاتا کہ ایک مردِ مومن کی آنکھ پر گرنے والے پردے کے نیچے کون سا نور اور کون سی معنوی بینائی ہے تو تم کہتے میرے رب رحیم کا لاکھ لاکھ شکر ہے! اس مرہم کو واضح کرنے کے لئے ایک واقعہ کو بیان کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ سلیمان جو کہ بارلا سے تعلق رکھتا ہے اور جس نے مسلسل آٹھ سال کمال وفاداری اور احترام کے ساتھ میری اس طرح سے بے لوث خدمت کی ہے کہ ایک دن بھی اُکتایا اور تنگ دل نہیں ہوا ڈ اس کی خالہ کی بینائی کھو گئی، وہ نیک عورت میرے بارے میں میرے حق سے سو درجے زیادہ حسنِ ظن رکھتی تھی، چنانچہ ایک دن اس نے مجھے مسجد کے دروازے پر روک لیا اور گویا ہوئی: دعا کریں کہ میری بینائی لوٹ آئے۔ تو میں نے اُس بابرکت مجذوب عورت کی صالحیت کو اپنی دعا کا سفارشی بنا کر یہ کہتے ہوئے گریہ زاری کی کہ اے پروردگار اس عورت کی نیکوکاری کے صدقے اس کی بینائی لوٹا دے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن ''بُور دُور'' کے علاقے سے ایک آنکھوں کا سپیشلسٹ ڈاکٹر آیا اور اس نے اُس کا اُوپر سے موتیے کا علاج کیا تو اس کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں، لیکن پھر چالیس دن کے بعد دوبارہ بے نور ہو گئیں۔ مجھے بہت دُکھ ہوا اور میں نے اس کے لیے بہت دعا کی۔ مجھے اُمید ہے کہ میری وہ دعا انشاء اللہ اُس کی آخرت کے لیے قبول

ہوئی ہوگی ورنہ میری یہی دُعا غلطی سے اس کے لیے بددعا تھی، کیونکہ اس کی اَجل مقرر میں صرف چالیس دن باقی رہ گئے تھے، چنانچہ وہ چالیس دن کے بعد فوت ہوگئی۔ رحمہا اللہ۔

اور یوں مرحومہ نے بارلا کے غمگین باغات کو بڑھاپے کی کمزور نظر کے ساتھ چالیس دن تک دیکھنے کی بجائے اپنی قبر میں چالیس ہزار دنوں تک جنت کے باغات کو دیکھنے میں کامیاب ہونے کی سعادت حاصل کرلی؛ کیونکہ وہ ایمان میں انتہائی مضبوط اور نیکوکاری میں بڑی پختہ خاتون تھی۔

**جی ہاں!** کسی مردِ مومن کی بینائی جب ختم ہوجاتی ہے اور وہ اسی حالت میں قبر میں داخل ہوجاتا ہے، تو وہ اپنے مرتبے کے مطابق دوسرے اہلِ قبور کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ عالمِ نور کا نظارہ کرتا ہے۔

جس طرح ہم اس دنیا میں کئی ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جنہیں نابینا اہلِ ایمان نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ نابینا لوگ اگر ایمان کی حالت میں جائیں گے تو قبروں میں اِسی حساب سے دیگر اہلِ قبور سے کئی درجے زیادہ جنت کے باغات کا نظارہ کریں گے اور سینما اسکرین کی طرح اپنے اپنے درجات کے مطابق وہاں سیر وسیاحت کریں گے۔ اور یہ ایسے ہی ہوگا جیسے آنکھوں پر ایسی عینکیں لگادی جائیں جو دُور کی چیزوں کو قریب کردیتی ہیں۔

ایسی روشن ترین آنکھ جو مٹی کے نیچے ہوتے ہوئے آسمانوں کے اُوپر والی جنت کو دیکھ لے اور وہاں ہر طرف کا نظارہ کرلے، آپ بھی اپنی اس ظاہری آنکھ کے پردے کے نیچے سے صبر وشکر کے ذریعے ایسی آنکھ حاصل کرسکتے ہیں۔ تمہاری آنکھوں کا ڈاکٹر قرآن حکیم ہے جو کہ تمہاری آنکھوں سے پردہ اُٹھادے گا اور تمہیں اس آنکھ کے ذریعے یہ سب چیزیں دکھادے گا۔

## پندرہویں دوا

آہ وفغان کرنے والے مریض! بیماری کی ظاہر صورت کو دیکھ کر ''آہ'' نہ کہو بلکہ اس کے معنی کی طرف دیکھ کر کہو: ''واہ''؛ کیونکہ بیماری کا اگر کوئی اچھا معنی نہ ہوتا تو خالقِ رحیم اپنے محبوب ترین لوگوں کو بیماریوں میں مبتلا نہ کرتا۔ ایک صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے: "أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَوْلِيَاءُ، اَلْاَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ" اَوْ كَمَا قَالَ مطلب یہ ہے کہ مشکلات ومصائب میں سب سے زیادہ وہ لوگ گرفتار ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ فضیلت والے اور باکمال ہوتے ہیں، اور وہ ہیں انبیاء۔ اور

ان میں سرِ فہرست حضرت ایوبؑ ہیں، پھر اولیاء کرام اور عام نیکو کار لوگ۔ ان لوگوں نے اپنی بیماریوں کو اس نظر سے دیکھا کہ یہ عبادتیں اور رحمانی تحفے ہیں، چنانچہ انہوں نے صبر وشکر کا مظاہرہ کیا اور بیماریوں کو خالقِ رحیم کی طرف سے آنے والا عملِ جراحی سمجھا۔

پس اے آہ وفغاں کرنے والے مریض! اگر تم اس نورانی قافلے کے ساتھ جا ملنا چاہتے ہو تو صبر سے مزیّن ہو کر شکر ادا کرنا سیکھو، ورنہ اگر شکوے کرو گے تو یہ لوگ تمہیں اپنے قافلے میں شامل نہیں کریں گے اور تم تاریک راہوں میں چلتے ہوئے اہلِ غفلت کے گڑھے میں جا گرو گے۔

**جی ہاں!** کچھ بیماریاں ایسی ہیں جو موت کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہیں لیکن معنوی شہادت کی طرح ولایت کے کسی نہ کسی درجے پر فائز کر جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر: ولادت کے عمل سے جنم لینے والی بیماریوں سے [1] پیٹ کے درد سے، جل کر اور طاعون سے وفات پانے والے معنوی شہادت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کچھ اور بھی بابرکت بیماریاں ہیں جو موت کے ذریعے ولایت کا درجہ عطا کر جاتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ بیماری دنیا کے عشق اور اس کے تعلقات میں کمی کر دیتی ہے، چنانچہ بیماری موت کے ذریعے اہلِ دنیا کے ناخوشگوار اور دردناک فراق کو ہلکا کر دیتی ہے بلکہ کبھی اس فراق کو محبوب بنا دیتی ہے۔

## سولہویں دوا

تنگ دلی و بےقراری کا شکوہ کرنے والے مریض! بے شک بیماری بیمار آدمی کو رحم دلی و احترام کا درس دیتی ہے جو کہ انسانی معاشرے کی دوا اہم ترین اور خوبصورت ترین خصوصیات سمجھی جاتی ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیماری انسان کو اُس بے پروائی اور خود انحصاری سے بچاتی ہے جو بالآخر اُسے وحشت و بربریت تک پہنچا دیتی ہے، کیونکہ نفسِ امّارہ صحت وعافیت سے جنم لینے والی بے پروائی وخود انحصاری کی وجہ سے بہت سے قابلِ احترام برادرانہ تعلقات کا احترام نہیں کرتا ہے اور شفقت ورحم دلی کے مستحق بیماروں اور آفت رسیدہ لوگوں کے لیے رحم دلی محسوس نہیں کرتا ہے۔ فرمان گرامی: ﴿ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ ﴾ میں یہی راز پایا جاتا ہے۔ اس لیے ایک بیمار آدمی کو اپنی بیماری میں جب

---

[1] ۔اس مرض سے معنوی شہادت کے حاصل ہونے کی مدت نفاس کے آغاز سے لے کر چالیس دن تک رہتی ہے۔ (مؤلف)

اپنے عجز وفقر کا علم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے قابلِ احترام بھائیوں کا احترام کرتا ہے اور اپنی تیمارداری کرنے والے کے لیے احترام کے جذبات محسوس کرتا ہے، وہ رحمت وشفقت کہ جس کا شمار اسلام کی اہم ترین خصوصیات میں سے ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دیگر مصیبت زدگان کو اپنی ذات پر قیاس کرتا ہے اور ان کے لیے شفقت کے جذبات رکھتا ہے اور ان کے دُکھ درد سے حقیقی طور پر متأثر ہوتا ہے، اور امکانی حد تک ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ کچھ اور نہ ہو سکے تو کم از کم بیمار آدمی کے لیے دعا تو کرتا ہے، تیمارداری کر کے ان کی خیر خیریت تو معلوم کرتا ہے۔ اور یہ چیز چونکہ شرعی طور پر سنت ہے اس لیے وہ ثواب کماتا رہتا ہے۔

## سترہویں دوا

اے بیماری کی وجہ سے نیک اعمال نہ کر سکنے کی شکایت کرنے والے مریض! شکر کر کہ جس نے تیرے لیے خالص ترین نیکیوں کا دروازہ کھول دیا ہے، اور یہ کہ بیماری دعا کے قبول ہونے کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ بیماری بیمار کے لیے اور اللہ کی رضا کی غرض سے اُس کی تیمارداری کرنے والوں کے لیے ہمیشہ ثواب مہیّا کرتی رہتی ہے۔

جی ہاں! بیماروں کی خدمت کرنے میں اہلِ ایمان کے لیے بہت زیادہ ثواب ہے، اور بیماروں کی خبر گیری اور تیمارداری ڈبشرطیکہ انہیں تنگ نہ کیا جائے ڈ ایک بلند پایہ سنت ہے اور یہ چیز گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے: مریضوں کی دعا لو، کیونکہ اُن کی دُعا مقبول ہے، اور خاص کر اگر وہ قریبی رشتے دار بھی ہوں، اور خاص کر جب والد ہو یا والدہ۔ کہ ان کی خدمت بڑی اہم عبادت اور بہت بڑے ثواب کی باعث ہے۔ پھر یہ ہے کہ بیماروں کی دلجوئی کرنا، انہیں خوش رکھنا اور ان کی تسلی کا سامان کرنا ایک اہم صدقے کا حکم لے لیتا ہے۔ اور سعادت مند انسان وہ ہے جو اپنے ماں باپ کا دل خوش کرتا ہے جو کہ بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے اور ان کی بیماری کے دنوں میں اُن کی دعائے خیر لیتا ہے۔

**جی ہاں!** یہ نیک بیٹا جو کہ کمال احترام اور پسری مہر ومحبت کے جذبے کے تحت اپنے اُن والدین کے ساتھ شفقت کا مظاہرہ کرتا ہے جو کہ معاشرتی زندگی میں سب سے زیادہ عزت واحترام والی حقیقت کا روپ رکھتے ہیں، فرشتے لوحِ وفا کو سامنے رکھتے ہوئے اس بیٹے کو مبارک باد دیتے ہیں اور ماشاء اللہ و بارک اللہ کہتے ہوئے اُسے داد دیتے ہیں۔

وہ لوحِ وفا جو کہ انسان کی بلندی اور بیٹے کی فضلیت کی منہ بولتی دلیل ہے۔

**جی ہاں!** بیماری کے دنوں کی کچھ اپنی ہی لذتیں ہیں جو کہ اُس رحمت، ہمدردی، غمگساری اور شفقت کے اُن جذبات سے جنم لیتی ہیں جن جذبات کی تہ میں لذت وشادمانی پوشیدہ ہوتی ہے اور جن کا ظہور اس ماحول میں ہوتا ہے۔ اس سے بیماری کا دُکھ درد معدوم ہو جانے کی حد تک کم ہو جاتا ہے۔

پھر یہ ہے کہ بیمار آدمی کی دعا کا قبول ہونا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ میں قولنج کی بیماری سے شفایابی کے لیے دعا کیا کرتا تھا جو مجھے تیس چالیس سال سے لگی ہوئی تھی۔ تو مجھے پتا چلا کہ بیماری مجھے دعا کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ اور دُعا، دعا کو یعنی خود اپنے آپ کو ختم نہیں کرتی۔[1] تو مجھے یقین ہو گیا کہ دعا کا نتیجہ اُخروی ہے اور دُعا عبادت کی ایک قسم ہے، چنانچہ مریض مرض کی طفیل اپنی عاجزی و درماندگی کا ادراک کر کے بارگاہِ الٰہی میں التجا کرتا ہے۔ لہٰذا میرے دل میں ترکِ دعا کا خیال نہ گزرا۔ کیونکہ میری دعا بظاہر قبول نہیں ہو رہی تھی حالانکہ میں تیس سال سے شفا کے لیے دعا کر رہا تھا، کیونکہ بیماری دعا کرنے کا وقت ہے، اور شفا دُعا کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ حکیمُ الرحیم جب شفا دیتا ہے تو محض اپنے فضل سے دیتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ دعا جب بالکل اُسی طرح قبول نہ ہو جیسے کہ ہم کرتے ہیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ قبول نہیں ہوئی؛ کیونکہ خالقُ الحکیم ہی جانتا ہے کہ بھلائی کس چیز میں ہے، چنانچہ وہ ہمیں وہ چیز دے دیتا ہے جو ہمارے لیے بہتر ہوتی ہے اور یوں وہ کبھی ہماری دنیا کے ساتھ تعلق رکھنے والی دُعا کا رُخ آخرت کی طرف پھیر دیتا ہے اور اس طرح وہ اُسے قبول کر لیتا ہے۔ بہرکیف وہ دُعا جو بیماری میں پائے جانے والے راز کی رُو سے خلوص کا درجہ پا لیتی ہے، اور خاص کر وہ دعا جو ضعف وعجز وتذلّل واحتیاج سے جنم لیتی ہے اور وہ دعا کی قبولیت کے لیے بہت ضروری ہے۔ پس دیندار مریض کو اور مریض کے اہلِ ایمان خدمت گاروں کو اس دعا سے بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

## اٹھارہویں دوا

اے شکر کو ترک کر کے شکوے شکایت کی راہ پر چل نکلنے والے مریض! شکوہ تو کسی حق کے تلف ہو جانے کا ہوتا ہے، اور تمہارا تو کوئی حق تلف نہیں ہوا جو شکوے کر رہے ہو! بلکہ تم نے تو کئی قسم کے ایسے شکر

[1] کچھ امراض اگرچہ باوجود اس کے کہ وہ دعا کے وجود کا سبب بنتے ہیں لیکن دعا جب مرض کے عدمِ وجود کا سبب بن جائے تو دعا کا وجود خود اپنے عدم کا سبب بن جائے گا، اور یہ ممکن نہیں۔ (مؤلف)

ادا نہیں کیے جنہیں ادا کرنا تمہارا فرض بنتا ہے، گویا کہ تم اللہ کا حق ادا کیے بغیر ناحق طریقے سے حق کے طلب گار سے ہوئے ہو اور یوں اپنے آپ کو برسرِ حق سمجھ کر شکوہ شکایت کر رہے ہو!

تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ اُن صحت مند لوگوں کو دیکھ کر شکوے کرتے رہو جو تمہیں اپنے سے بہتر درجے میں نظر آتے ہیں، بلکہ تم اس چیز کے مکلف ہو کہ اُن مسکین اور نادار بیماروں کو دیکھو جو صحت کے لحاظ سے تم سے نچلے درجے میں ہیں تاکہ شکر گزار رہو۔ اگر تمہارا ایک ہاتھ ٹوٹ جائے تو ان لوگوں کو دیکھو جن کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں، اگر تمہاری ایک آنکھ نہ ہو تو ان اندھوں کو دیکھو جن کی دونوں آنکھیں نہیں ہیں۔ اور اللہ کا شکر کرو۔

**جی ہاں!** کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ نعمت کے ضمن میں اپنے سے اُوپر والے لوگوں کو دیکھ کر شکوہ کرتا پھرے۔ اور مصیبت کے ضمن میں ہر ایک کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو نظر میں رکھے جو اُس سے بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں، تاکہ شکر ادا کرے اس راز کو بعض رسائل میں ایک تمثیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

ایک بڑا آدمی کسی مسکین کا ہاتھ پکڑ کر اسے مینار کی چوٹی تک لے جاتا ہے اور ہر زینے پر اُس پر احسان کرتے ہوئے اسے بطور ہدیہ کوئی نہ کوئی چیز دیتا ہے، اور مینار کی چوٹی پر پہنچ کر اسے کوئی سب سے بڑا ہدیہ دیتا ہے۔ اب ان انواع واقسام کے تحفوں کے مقابلے میں وہ اُس مسکین سے صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ شکر وسپاس گزاری کا اظہار کرے۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ کمینہ آدمی زینہ بہ زینہ ملنے والے ان تمام تحفوں کو بھول جائے یا انہیں غیر اہم اور کالعدم قرار دے کر اس آدمی کا شکر یہ ادا نہ کرے بلکہ اُوپر کی طرف دیکھے اور شکوہ کرتے ہوئے کہے: کاش یہ مینارہ کچھ اور اُونچا ہوتا اور میں کچھ اور اُوپر جا سکتا! یہ مینارہ اس پہاڑ کی طرح یا اس دوسرے مینار کی طرح بلند کیوں نہیں ہے؟ تو یقیناً اس کا یہ انداز ظلم اور کفرانِ نعمت ہوگا۔

یہی حالت انسان کی ہے، حالانکہ یہ عدم سے وجود میں آیا ہے اور پتھر یا درخت نہیں بن گیا، اور حیوان ہی نہیں رہا بلکہ انسان بنا اور مسلمان ہوا اور ایک عرصے تک صحت وعافیت سے بہرہ وَر رہا اور ناز و نعمت میں پلتا رہا۔ لیکن یہی انسان جب بعض رُکاوٹوں کے نتیجے میں صحت وعافیت کا استحقاق کھو بیٹھے، یا اپنے سوئے اختیار سے یا سوئے استعمال سے اور یا پھر اپنی پہنچ سے باہر ہونے کی وجہ سے بعض نعمتوں

سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے شکوے اور اس کی ربوبیت پر اعتراض کی بوچھاڑ کر دے اور جزع فزع کا اظہار کرتا ہوا کہے۔ الامان والحفیظ میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر یہ بلا نازل ہوئی ہے! تو اس طرح کی صورت حال ایک معنوی بیماری ہے جو کہ مادی بیماری سے بھی بڑی مصیبت ہے۔ ایسا آدمی حرفِ شکایت زبان پر لاکر ٹوٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ لڑنے کی طرح اپنی بیماری میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

پس عقل مند آدمی وہ ہے جو فرمان گرامی: ﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ١٥٦﴾ میں پائے جانے والے راز کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اور اس وقت تک صبر و شکیبائی سے کام لیتا ہے، تا آنکہ بیماری اپنی ڈیوٹی پوری کر کے چلی جائے۔

## انیسویں دوا

جمیل و جلیل پروردگار اپنے اسمائے گرامی کو اپنی صمدانی تعبیر کے ذریعے ''اسمائے حسنیٰ'' کہہ کر یہ واضح کرتا ہے کہ اس کے تمام اسمائے گرامی خوبصورت ہیں، اور یہ کہ صمدانیت کا جامع ترین، خوبصورت ترین، اور لطیف ترین آئینہ ''زندگی'' ہے۔ کیونکہ خوبصورت کا آئینہ بھی خوبصورت ہوتا ہے اور وہ آئینہ جو اُس خوبصورت ہستی کے محاسن کو منعکس کرتا ہے وہ خود بھی خوبصورت ہو جاتا ہے۔ تو جس طرح اس آئینے پر اس خوبصورت کی طرف سے آنے والی ہر چیز خوبصورت ہوتی ہے اسی طرح زندگی پر واقع ہونے والی ہر چیز حقیقت کی نگاہ میں اچھی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ان خوبصورت اسمائے حسنیٰ کے خوبصورت نقوش کا دیدار کراتا ہے۔ پس زندگی اگر صحت و عافیت کی صورت میں ہمیشہ یکساں طور پر ایک ہی ڈگر پر چلتی رہے تو نہ صرف یہ کہ ناقص آئینے کے رُوپ میں رہے گی بلکہ ایک جہت سے عدم و فنا و انعدام کا احساس دلائے گی، انقباض پیدا کرے گی، زندگی کی قیمت گھٹائے گی اور عمر کی لذت کو سینے کی تنگی میں تبدیل کر دے گی اور یوں انسان چاہتا ہے کہ اس کا وقت جلد جلد کٹ جائے، چنانچہ اس طرح وہ انقباض کی وجہ سے خود کو جرم و گناہ اور لہو و لعب کی گود میں گرا دیتا ہے اور جیل میں کٹنے والی مُدّت کی طرح وہ اپنی قیمتی عمر کے ساتھ برسرِ پیکار ہو جاتا ہے، اس عمر عزیز کو قتل کرنے اور اُسے جلد از جلد گزارنے کے در پَے ہو جاتا ہے۔ لیکن زندگی مختلف حالات و اطوار کے مابین تحوّل و تحرّک و تقلّب کی حالت میں رہ کر اپنی قیمت کا احساس دلاتی، عُمر کی اہمیت اور لذت کو اُجاگر کرتی رہتی ہے، اس لیے انسان نہیں چاہتا کہ اس کی

عمر بیت جائے، اگرچہ وہ مشقت اور مصیبت میں ہی ہو، اور انقباض وتنگ دلی سے اُکتا کر یہ نہیں کہتا: پناہ بخدا! کیا ابھی تک سورج نہیں ڈوبا ہے؟ رات ختم نہیں ہوئی؟

**جی ہاں!** کسی دولت مند بے کار آدمی سے پوچھو جو عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، جس کے پاس دنیا کی ہر نعمت ہے، اس سے پوچھو کہ کیا حال ہے؟ تو جواب میں کچھ اس طرح کے دردناک کلمات سنوگے: پناہ بخدا! وقت نہیں گزرتا ہے۔ آؤ ذرا شطرنج کھیل لیں یا وقت گزاری کے لیے لہوولعب کا کوئی اور طریقہ ڈھونڈیں۔ یا پھر اُس سے لمبی اُمیدوں سے جنم لینے والی کچھ اس طرح کی شکایتیں سنوگے: مجھے فلاں چیز نہیں ملی۔ کاش کہ میں اس طرح کر لیتا! اور ذرا کسی مصیبت زدہ، محنت کش اور فقیر انسان کو اس کی بدترین حالت میں پوچھو: کیا حال ہے؟ تو وہ ڈ اگر عقل مند ہوگا تو ڈ کہے گا: پروردگار کا شکر ہے کہ میں صحیح سالم ہوں اور کام کر رہا ہوں۔ کاش سورج جلدی غروب نہ ہوتا تو میں یہ کام نپٹا لیتا! وقت پَر لگا کر اُڑتا جا رہا ہے اور عمر ہے کہ ٹھہرتی ہی نہیں۔ میں اگرچہ حقیقتاً محنت مشقت کر رہا ہوں لیکن یہ بھی بہر کیف گزر ہی جائے گی ہر چیز تیزی سے گزرتی جا رہی ہے۔ چنانچہ وہ اسی طرح کہے گا اور عمر کے گزر جانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہے گا: بے شک عمر معنوی طور پر بڑی قیمتی چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے کہ عمر کی لذت اور زندگی کی قیمت محنت، مشقت اور عمل وکردار میں پوشیدہ ہے، اور یہ کہ صحت وراحت عمر کو المناک بنا دیتی ہیں۔ اسی بنا پر وہ تمنا کرتا ہے کہ عمر جلد از جلد گزر جائے۔

میرے مریض بھائی! یاد رکھو کہ جیسا کہ دیگر رسائل میں تفصیل کے ساتھ قطعی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ شرور ومصائب حتیٰ کہ گناہوں کا سرچشمہ اور خمیر عدم ہے، اور عدم شرِّ محض اور سرتاپا تاریکی ہے۔ پس ایک ہی ڈھنگ پر اور ایک ہی وطیرے پر توقف، راحت، سکوت اور سکونت جیسے حالات چونکہ عدم اور فنا کے قریب تر ہیں، اس لیے عدم میں پائی جانے والی تاریکی کا احساس دلاتے ہیں اور نتیجتاً انقباض اور تنگ دلی کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن حرکت اور تحوّل وتغیّر چونکہ وجود ہیں اس لیے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ اور وجود نور اور خیرِ محض ہے۔

حقیقت جب یہی ہے، تو تم میں جو بیماری پائی جاتی ہے وہ تمہارے بدن میں ایک مہمان بنا کر بھیجی گئی ہے اور اس کے ذمے اس بیش قیمت زندگی کو سنوارنے، نکھارنے، اِسے قوت فراہم کرنے، اسے ترقی دینے اور بلندی سے آشنا کرنے اور تمہارے جسم میں پائے جانے والے تمام انسانی کل پُرزوں کی

توجہ اس بیمار عضو کے تعاون کی طرف کرنے اور اس طرح صانعُ الحکیم کے اسمائے گرامی کے مختلف نقوش کو آشکار کرنے کی طرح کی بہت سی ڈیوٹیاں لگا دی گئی ہیں۔ چنانچہ یہ بیماری اپنی ذمہ داری جلدی جلدی ادا کر کے واپس چلی جائے گی انشاءاللہ اور صحت و عافیت سے کہے گی: آؤ اور ہمیشہ کے لیے یہی جگہ لے لو، اپنی ذمہ داری سنبھالو اور خدمت سرانجام دو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اس میں بخیر و عافیت رہائش اختیار کرو۔

## بیسویں دوا

اے اپنی بیماری کی دوا کے متلاشی مریض! بیماری کی دو قسمیں ہیں: حقیقی بیماری اور وہمی بیماری۔ جہاں تک تعلق ہے حقیقی بیماری کا، تو بے شک شافیٔ حکیمِ ذوالجلال نے ہر بیماری کی دوا پیدا کی ہے اور اسے اپنی کرۂ ارض جیسی سب سے بڑی فارمیسی میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔ پس یہ دوائیں بیماریوں کا تقاضا کرتی ہیں۔ پس ان سے علاج کرنا اور انہیں بطور دوا استعمال کرنا شرعی طور پر جائز ہے۔ لیکن یہ اعتقاد رکھنا بہر کیف ضروری ہے کہ تاثیر اور شفا اللہ کی طرف سے ہے، چنانچہ جس طرح اُس نے بیماری دی ہے اُسی طرح شفا بھی دے گا۔ کسی دیندار حاذق طبیب کی ہدایات پر عمل کرنا ایک اہم علاج ہے، کیونکہ اکثر بیماریاں سوئے استعمال، بد پرہیزی، اسراف وسیئات، گناہ گاری اور عدم اہتمام کی وجہ سے جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ اور ایک دیندار طبیب شریعت کے دائرے میں رہ کر مریض کو نصیحت کرے گا اور ہدایات دے گا، اسے تسلی دے گا اور بہر صورت اسے اسراف اور سوئے استعمال سے منع کرے گا چنانچہ مریض اُن تسلی بخش مشوروں پر اور اُن ہدایات پر اعتماد کرے گا اور یوں اس کی بیماری ہلکی ہو گی اور وہ انقباض کی بجائے فرح وسُرور سے ہمکنار ہو گا۔

**رہی وہمی بیماری**، تو اس کا مؤثر ترین علاج یہ ہے کہ اُسے کوئی اہمیت نہ دی جائے، کیونکہ اسے جتنی اہمیت دی جائے گی وہ اتنی ہی بڑھتی جائے گی اور اگر اس کی پروا نہ کی جائے گی تو گھٹتی گھٹتی بکھر جائے گی۔ جیسے کہ اگر کوئی شہد کی مکھیوں کو چھیڑے گا تو وہ اس پر حملہ کر دیں گی۔ اور اگر ان کی طرف توجہ نہیں دے گا تو وہ منتشر ہو جائیں گی۔ اسی طرح اگر وہ اندھیرے میں آنکھوں کے سامنے حرکت کرنے والی رسی سے جنم لینے والے خیال کی طرف توجہ دے گا تو وہ خیال بڑا ہوتا جائے گا حتی کہ اسے ڈرا کر دیوانہ وار بھاگنے پر مجبور کر دے گا، لیکن اگر اس کی طرف توجہ نہیں دے گا تو اسے نظر آئے گا کہ یہ سانپ نہیں بلکہ ایک عام

سی رسی ہے۔ اور وہ اپنے ذہنی خوف و اضطراب پر ہنس دے گا۔

یہ وہمی بیماری جب زیادہ لمبی ہو جائے تو حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہمی اور اعصابی لوگوں میں یہ بیماری ایک خطرناک قسم کی بیماری کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ یہ رائی کو پہاڑ بنا دیتی ہے اور انسان کی معنوی قوت کو توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ اور خاص کر ایسا انسان اگر بے رحم قسم کے نیم حکیموں اور ظالم ڈاکٹروں کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اس کے وہم کو مزید تحریک دے دیتے ہیں۔ اور یوں مریض اگر امیر ہو تو مال سے، ورنہ عقل سے اور صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

## اکیسویں دوا

اے میرے مریض بھائی! تمہاری بیماری میں ایک مادی رنج والم پایا جاتا ہے لیکن تمہیں چاروں طرف سے ایک ایسی اہم معنوی لذت نے گھیرا ہوا ہے جو اس مادی الم کی تاثیر کو زائل کرتی جا رہی ہے؛ کیونکہ تمہارا یہ مادی الم تمہاری بچپن کی اُس لذیذ رافت وشفقت سے بڑھ کر نہیں ہے جسے تم مدت سے فراموش کر چکے ہو۔ اور جو اب تمہارے والدین اور عزیز و اقارب کی تمہاری طرف متوجہ ہونے کی صورت میں نئے سرے سے پھوٹ رہی ہے۔ اگر تمہارے والدین اور عزیز و اقارب ہوں تو چنانچہ اس طرح تم اُن میٹھی میٹھی نظروں کو بھی دیکھ رہے ہو جنہیں لڑکپن میں دیکھ چکے ہو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ تمہارے گرد و پیش میں تمہارے کتنے ہی ایسے مخفی اور مستور دوست احباب ہیں جو اس بیماری کی کشش سے کھچے چلے آئیں گے اور تمہیں محبت بھری نظروں سے دیکھیں گے۔ اور اس طرح تمہاری یہ مادی بیماری اس محبت اور شفقت کے جذبات کے مقابلے میں بالکل ہلکی اور ارزاں سی ہو کر رہ جائے گی۔

- پھر یہ ہے کہ جن لوگوں کی تم فخر کے ساتھ خدمت میں رہے ہو اور جن کی نگہِ التفات کے لیے تگ و دو کرتے رہے ہو، وہ لوگ اب شفقت بھرے رویّے کے ساتھ تمہاری خدمت میں لگ گئے ہیں، اور یوں تُم اپنے سرداروں کے بھی سردار بن جاتے ہو۔
- پھر یہ بھی ہے کہ اس بیماری کے باعث تم نے مزید بہت سے مشفق اور معاون دوست احباب پا لیے ہیں جن کی وجہ سے تم انسانی ہمدردی اور برادرانہ شفقت سے بہرہ ور ہو گئے ہو۔

اور یہ بھی ہے کہ اس بیماری کے طفیل تمہیں بہت سے پُر مشقت کاموں سے رخصت مل جاتی ہے

اورتم بسترِ راحت پرآرام کرتے ہو۔

بنابریں، یہ ضروری ٹھہرا کہ تمہارا یہ جزوی درد والم تمہیں ان معنوی لذتوں کے مقابلے میں شکوہ شکایت کی بجائے کشاں کشاں شکروسپاس کی جانب لے جائے۔

## بائیسویں دوا

اے فالج جیسے شدید مرض میں مبتلا مریض! اوّلاً تو میں آپ کو یہ خوشخبری دیتا ہوں کہ فالج مومن آدمی کے لیے ایک بابرکت مرض شمار کیا جاتا ہے۔

یہ چیز میں نے اہل اللہ سے بہت عرصے سے سن رکھی تھی لیکن مجھے اس میں پائے جانے والے راز کا پتا نہ چل سکا۔ اب اس کا ایک راز دل پر وارد ہورہا ہے، اور وہ کچھ اس طرح ہے کہ اہل اللہ نے اللہ تک پہنچنے، دنیا کے بڑے بڑے معنوی خطرات سے بچنے اور ابدی سعادت سے ہمکنار ہونے کے لیے دو بنیادوں کو اختیار کیا ہے:

پہلی بنیاد ہے: **رابطۃ الموت**، اس کا مطلب یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی ابدی زندگی کے لیے اس تصوّر کے ساتھ عمل کیا کہ یہ دنیا فانی ہے۔ اور یہ کہ وہ اس دنیا میں ایک فنا پذیر مہمان اور ملازم ہے۔

دوسری بنیاد یہ ہے: انہوں نے نفسِ امارہ کی ہلاکتوں سے اور اندھے جذبات واحساسات سے خلاصی پانے کے لیے ریاضتوں اور چلّہ کشیوں کے ذریعے نفس امّارہ کو مارنے کی کوشش کی۔ اورتم اے میرے بھائی جو اپنے جسم کی آدھی صحت سے محروم ہو گئے ہو، تمہیں بلا اختیار وہ دو مختصر اور آسان سی بنیادیں مل گئی ہیں جو سعادت مندی کا سبب ہیں، اور وہ اس طرح کہ تمہارے بدن کی یہ کیفیت ہمیشہ دنیا کے زوال اور انسان کی فنا پذیری کی یاد دلاتی رہے گی۔ اس لیے دنیا تمہیں ڈبو نہیں سکے گی اور غفلت تمہاری آنکھ بند نہیں کر سکے گی۔ اور نفسِ امارہ نفسانی خواہشات اور رذیل شہوات و رغبات کے ذریعے ایسے انسان کو دھوکہ نہیں دے سکے گا جو کہ آدھے انسان کی حالت میں ہے چنانچہ ایسا انسان اس نفس کی آفت سے بہت جلد نجات حاصل کر لیتا ہے۔

پس مومن آدمی ایمان اور توکّل وتسلیم میں پائے جانے والے راز کی بدولت فالج جیسی شدید بیماری سے تھوڑی سی مدت میں اہل اللہ کی چلہ کشیوں جیسے فائدے اُٹھا لیتا ہے اور اس وقت وہ شدید بیماری بہت

ارزاں اور آساں ہو جاتی ہے۔

## تئیسویں دوا

اے مسکین، اجنبی اور تنہا مریض! بیماری کے ساتھ ساتھ اجنبیت اور تنہائی اگر تمہارے سامنے پتھر دلوں میں نرمی پیدا کر دیں اور تمہارے لیے ان میں شفقت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیں، تو پھر کتنی حیرانی کی بات ہو گی کہ اگر یہی بیماری اور اجنبیت تمہارے اُس خالقِ رحیم کی نظرِ رحمت کو تمہاری طرف متوجہ نہیں کرے گی جو قرآن کی تمام سورتوں کے اوائل میں ہمیں اپنا تعارف اپنے رحمان و رحیم ہونے کی حیثیت سے کرواتا ہے اور اپنی شفقت کی ایک کرن کے ساتھ تمام بچوں کو اُن کی ماؤں کی خارقِ عادت شفقت کے ذریعے پروان چڑھاتا ہے، اور اپنی رحمت کے ایک جلوے کے ساتھ ہر موسم بہار میں روئے زمین کو اَن گنت نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے اور جنت اپنی تمام تر خوبیوں اور خوبصورتیوں کے ساتھ ابدی زندگی میں اس کی رحمت کا ایک جلوہ ہو گی۔

**جی ہاں!** بے شک ایمان کے ذریعے تمہارا اُس کی طرف منسوب ہونا، اُسے پہچان جانا اور بیماری کی عاجزانہ زبان کے ساتھ اس کے حضور میں گریہ زاری کرنا اور اس اجنبیت میں تمہاری یہ بیماری اور یہ تنہائی یہ تمام چیزیں اُس کی نظرِ رحمت کو تمہاری طرف متوجہ کرتی ہیں اور یہ نظرِ رحمت ہر چیز کا نعمُ البدل ہو جاتی ہے۔

تو جب خالق موجود ہے، اور وہ تمہیں نظر میں رکھتا ہے، تو پھر تمہارے لیے ہر چیز موجود ہے۔ اجنبیت اور تنہائی کا شکار درحقیقت وہ آدمی ہے جو ایمان اور تسلیم و رضا کے ذریعے اس کی طرف نسبت نہیں رکھتا ہے، یا اُس کی طرف منسوب ہونے کو چنداں اہمیت نہیں دیتا ہے۔

## چوبیسویں دوا

اے معصوم مریض بچوں کی اور بچوں جیسے بوڑھوں کی تیمارداری اور دیکھ بھال کرنے والے لوگو! تمہارے سامنے ایک اہم اُخروی تجارت موجود ہے، اس تجارت کو اشتیاق و اہتمام کے ساتھ حاصل کر لو۔ معصوم بچوں کی بیماریاں ان کے نرم و نازک جسموں کے لیے مستقبل میں پیش آنے والے دُنیا کے حادثات و واقعات کا مقابلہ کرنے کی قوّت حاصل کرنے کے لیے ایک تمرین، ورزش، حفاظتی ٹیکے اور

ربّانی تربیت کا حکم رکھتے ہیں۔ اسی طرح اُن کی یہ بیماریاں دنیاوی زندگی کے ساتھ تعلق رکھنے والی ان جیسی حکمتوں کے ساتھ ساتھ ان کی رُوحانی زندگی کے لیے وسیلہ کار اور ان کی مادی زندگی کی صفائی ستھرائی کا دارومدار بن جاتی ہے، جس طرح یہ بیماریاں بڑوں کے لیے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں اسی طرح بچوں کے لیے یہ بیماریاں ان کے مستقبل میں یا آخرت میں ان کے لیے معنوی ترقی کے ٹیکے کا حکم رکھتی ہیں۔

اور بچوں کی اس طرح کی بیماریوں سے حاصل ہونے والا ثواب والدین کے اعمال نامے میں لکھ دیا جاتا ہے، اور خاص کر اس والدہ کے اعمال نامے میں جو شفقت میں پائے جانے والے راز کی رُو سے بچے کی صحت کو اپنی صحت پر ترجیح دیتی ہے، جیسے کہ اہلِ حقیقت کے ہاں یہ چیز ثابت ہے۔

رہی بزرگوں کی تیمارداری، تو یہ چیز تیماردار کے لیے ثواب کا باعث ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سی صحیح روایات اور تاریخی واقعات سے یہ چیز ثابت شدہ ہے کہ ان بزرگوں کی دعائیں لیناڈ اور خاص کر یہ بزرگ اگر والدین ہوں ڈان کا دل بہلانا اور اُن کی پوری وفاداری کے ساتھ خدمت کرنا دنیاوی اور اُخروی سعادت کا وسیلہ بھی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جیسے یہ بات ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اپنے بوڑھے والدین کی مکمل طور پر اطاعت کرنے والا سعادت مند بیٹا اپنی اولاد سے بھی اسی طرح کی اطاعت گزاری سے بہرہ یاب ہوگا۔ چنانچہ بہت سی صحیح روایات اور تاریخی واقعات سے یہ بات ثابت ہے کہ اسی طرح ایک بدبخت بیٹا جب اپنے والدین کی نافرمانی کرتا ہے تو آخرت کے عذاب کے علاوہ اس دنیا میں بھی بہت سی آفات وخطرات کی صورت میں سزا پاتا ہے۔

**جی ہاں!** ایک مومن آدمی صرف یہی نہیں کہ اپنے عزیز واقارب کی خدمت کرے بلکہ مومن آدمی کا سامنا جب ایسے عاجز وناتواں قابلِ احترام بیمار بزرگوں سے ہو جو مدد کے محتاج ہوں تو ایسے میں اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صمیم قلب ورُوح سے ان کی خدمت کرے؛ کیونکہ رازِ ایمان کی رُو سے ان کے درمیان حقیقی اخوّت پائی جاتی ہے۔

## پچیسویں دوا

اے میرے مریض بھائیو! اگر تم ہر بیماری کے لیے کوئی انتہائی مفید قدسی تریاق اور لذیذ ترین حقیقی دوا چاہتے ہو تو پھر اپنے ایمان کے انکشاف وجِلا کاری میں بڑھتے چلے جاؤ، مطلب یہ کہ اس قدسی تریاق

یعنی ایمان کو اور اس سے جنم لینے والے علاج کو استعمال میں لاؤ یعنی اُسے توبہ و استغفار اور نماز و عبادت کے ساتھ استعمال میں لاؤ۔

**جی ہاں!** ایسے لگتا ہے جیسے کہ دنیا کی محبت اور اس کے ساتھ شدید تعلق کی وجہ سے اہلِ غفلت کے پاس خود اِس دنیا کے حجم کے برابر ایک بہت بڑا بیمار جسم ہے۔ ایمان ان کے اس دنیا جیسے بڑے، زوال و فراق کی ضربوں سے لگے ہوئے زخموں سے چُور اور بیمار جسم کو دفعتاً زخموں سے محفوظ کرتا ہے اور اسے حقیقی شفا عطا کرتا ہے۔

یہ بات ہم نے بہت سے رسائل میں قطعی طور پر ثابت کر دی ہے اور تمہیں اُکتاہٹ سے بچانے کے لیے میں اسے مختصر طور پر کہتا ہوں:

بقدرِ امکان فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ایمان کا علاج انتہائی مؤثر ہے۔ اور یہ کہ غفلت و گناہ، نفسانی خواہشات اور غیر شرعی تفریحات اور دل لگیاں اس تریاق کی تاثیر کے آگے رُکاوٹ بن جاتی ہیں۔

بیماری جب غفلت کا پردہ چاک کر دیتی ہے، اشتہا کا قلع قمع کر دیتی ہے اور غیر شرعی لذتوں کی راہ میں رُکاوٹ بن جاتی ہے، تو پھر اس سے بھرپور فائدہ اُٹھاؤ اور توبہ و استغفار اور دعا و ابتہال کے ذریعے حقیقی ایمان کے انوار کو اور اس کی قدسی دواؤں کو استعمال میں لاؤ۔

اللہ تعالیٰ تمہیں شفا دے اور تمہاری بیماریوں کو گناہوں کا کفارہ بنا دے! آمین آمین آمین۔

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ﴾

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾﴾

{اللهم صلّ على سيدنا محمد طبِّ القلوب و دوائها و عافية الأبدان و شفائها، و نور الابصار و ضيائها و على آله و صحبه و سلم}

# سترہواں مکتوب

## بچوں کی تعزیت کے بارے میں
## یہ پچیسویں لمعہ کی ذیلی بحث ہے

بِاسۡمِهٖ سُبۡحَانَهٗ

﴿وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ﴾ (الاسراء:۴۴)

میرے عزیز اُخروی بھائی! حافظ خالد آفندی

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِیۡنَ۔ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡهِ رَاجِعُوۡنَ﴾ (البقرة:۱۵۵۔۱۵۶)

میرے بھائی! بچے کی وفات نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا ہے اور مجھے اس کا بہت دکھ ہوا ہے۔لیکن الحکمُ للہ۔پس اس کے فیصلے پر تسلیم و رضا کا شیوہ ہی اسلام کا شعار ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو آپ کے لیے سفارشی اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔

ذیل میں ہم پانچ نقطے بیان کر رہے جو آپ کے لیے اور آپ جیسے تقوی شعار اہلِ ایمان کے لیے خوشخبری اور حقیقی تسلی کا باعث بنیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی ﴿وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ﴾ (الواقعة:۱۷) میں پایا جانے والا راز اور اس کی مثال یہ ہے کہ:

اہلِ ایمان کی اولاد میں سے جو بچے بلوغت کو پہنچنے سے پہلے مرجاتے ہیں وہ جنت میں، جنّت کے شایانِ شان طریقے سے ہمیشہ رہنے والے دائمی محبوب بچے بن کر رہیں گے۔اور اپنے جنت میں داخل ہونے والے والدین کی گودوں میں انہیں خوش رکھنے کا ابدی وسیلہ بن جائیں گے اور والدین کے اُس

لطیف ترین ذوق کا سبب بن جائیں گے، اور وہ ذوق ہے والدین کا بچوں کے ساتھ لاڈ پیار۔

اور یہ آیت کریمہ ﴿وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾(الواقعة:١٧) کے جملے کے ذریعے اشارہ کرتی اور خوشخبری دیتی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنّت میں اولاد کی محبت اور ان کے ساتھ لاڈ پیار کے علاوہ ہر لذیذ شئے موجود ہے؛ کیونکہ جنت میں تناسل کا سلسلہ نہیں ہوگا؛ ان کی یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اور یہ کہ اہلِ ایمان کی سعادت مندی کا سب سے بڑا وسیلہ اس دنیا میں آلام ومصائب میں آلودہ دس سال کی تھوڑی سی مدت میں بچوں کی محبت اور ان کے لاڈ پیار کے مقابلے میں ہمیشہ رہنے والے بچوں کی اس محبت کو اور اس لاڈ پیار کو حاصل کرنا ہے جس میں کسی بھی طرح کے دکھ درد کی آلودگی نہیں ہوگی اور جو لاکھوں سال تک کے لیے ہوگا۔

**دوسرا نقطہ:** ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی معزّز آدمی کو جیل ہوگئی...... پھر کچھ دیر بعد اس کے محبوب بیٹے کو اس کے پاس جیل میں بھیج دیا گیا۔ اب وہ مسکین قیدی اپنی ذاتی مصیبتیں تو سہتا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ زیادہ دکھ اُسے اس بات کا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی تکلیفیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن اُن کا مداوا کرنے سے عاجز اور اُسے راحت پہنچانے سے قاصر تھا۔

ایک دن ایسے ہوا کہ حکمرانِ مہربان نے اس کے پاس ایک آدمی بھیجا۔ اس آدمی نے آکر اُسے کہا: حاکم کا کہنا ہے کہ یہ بچہ اگرچہ آپ کا بیٹا ہے، لیکن یہ میری قوم اور میری رعایا سے ہے، اس لیے اسے میں آپ سے لے رہا ہوں اور اس کی اپنے خوبصورت محل میں تربیت کروں گا۔ تو وہ آدمی رونا پیٹنا شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے: میرا بیٹا جو کہ میری تسلّی کا باعث ہے وہ میں حاکم کو ہرگز نہیں دوں گا۔ لیکن اس کے ہمراہی اس سے کہنے لگے: تمہاری یہ پریشانی بے معنی ہے۔ کیونکہ اگر تمہاری پریشانی اپنے بچے کی وجہ سے ہے تو وہ اس گندے، تاریک اور دکھ دینے والے قید خانے سے نکل کر ایک عالی شان محل میں جا رہا ہے جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور جہاں سعادتمندی کا راج ہے! اور اگر تمہاری یہ پریشانی خود اپنی وجہ سے ہے، اور تمہارے پیشِ نظر صرف اپنی مصلحت ہی ہے، تو یاد رکھو کہ اگر بچہ تمہارے پاس رہا تو یہ بچہ بہت سے دکھ درد اُٹھائے گا اور تنگیوں کا سامنا کرے گا، اور اس کے مقابلے تمہیں جو سکھ ملے گا وہ انتہائی محدود، مشکوک اور وقتی سا ہوگا۔ لیکن اگر بچہ وہاں چلا گیا تو تمہیں اس کے ہزاروں فائدے حاصل ہوں گے؛ کیونکہ یہ تمہارے لیے بادشاہ کی مہر ومحبت کو کھینچنے کا سبب بنے گا اور تمہارے لیے ایک قسم کا

سفارشی بن جائے گا!

پھر یہ ہے کہ بادشاہ بچے کی تمہارے ساتھ ملاقات بھی کرواتا رہے گا، اور یہ تو ظاہر ہے کہ وہ ملاقات کے لیے بچے کو جیل میں نہیں بھیجے گا بلکہ تمہیں جیل سے نکال کر وہاں محل میں لے جائے گا بشرطیکہ تم حاکم پر بھروسا کرو اور اُس کے مطیع رہو......

میرے عزیز بھائی! آپ جیسے اہلِ ایمان جن کے بچے فوت ہو جاتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے حالات میں اس انداز سے سوچیں کہ:

یہ بچہ بالکل معصوم ہے، اور اس کا خالق رحیم و کریم ہے، اس لیے وہ اِسے میری ناقص شفقت اور تربیت کے بدلے میں اپنی کامل رحمت اور عنایت کے سائے میں لے گیا ہے۔ اور اس نے اُسے دنیا کے اِس مصیبتوں، مشقتوں، کلفتوں اور کدورتوں سے اَٹے ہوئے قید خانے سے نکال کر اپنی جنّت الفردوس کی طرف بھیج دیا ہے۔ پس کتنا خوش نصیب ہے یہ بچہ!

اور کون جانتا ہے کہ اگر وہ بچ جاتا اور دنیا میں رہتا تو کیا کرتا؟ اس لیے میں اس کے جانے پر دکھی نہیں ہوں اور اُسے نیک بخت سمجھتا ہوں!

رہا میرا اپنی ذات کے لیے دُکھی ہونا، تو اس کے جانے پر جو فائدے مجھے حاصل ہونے والے ہیں، ان کے پیشِ نظر میں بہت زیادہ دُکھ کا اظہار نہیں کر رہا ہوں؛ کیونکہ اگر وہ دنیا میں باقی رہتا تو کم و بیش دس سال کی محدود سی مدّت کے لیے مجھے وہ محبت دے دیتا جو ایک بچہ اپنے باپ کو دیتا ہے، لیکن اُس محبت میں بھی دُکھ درد کی آمیزش ہوتی! پھر اگر وہ نیک اور دنیاوی کاموں میں طاقت وَر ہوتا، تو ممکن ہے کہ اُمورِ دنیا میں میرا ہاتھ بٹاتا!

لیکن اب اپنی وفات کی وجہ سے وہ میرا ایک قسم کا سفارشی بن جائے گا، ابدی سعادت میں داخل ہونے کے لیے وسیلہ بنے گا، اور ابدی جنّت میں دس ملین سال کے لیے بیٹے کی طرف سے ملنے والی محبت کا سبب بنے گا۔

بلاشبہ جو آدمی جلد حاصل ہو جانے والے مشکوک نفع سے محروم ہو جائے اور اس کے بدلے میں دیر سے لیکن بہر صورت اور لازمی طور پر حاصل ہو جانے والے نفع سے ہمکنار ہو جائے، تو وہ دردناک قسم کی آہ و فغاں نہیں کرے گا اور نا اُمید ہو کر فریاد نہیں کرے گا۔

**تیسرا نقطہ:** فوت ہو جانے والا بچہ خالقِ رحیم کی مخلوق، اس کا مملوک، اس کا غلام، اس کی صنعت کا شاہکار اور اپنی مجموعی ہیئت کے ساتھ اُسی کا تھا۔ اور وہ اپنے ان تمام اوصاف کے ساتھ اپنے والدین کا دوست تھا جسے وقتی طور پر ان کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا اور والدین کو اس کا خادم بنا دیا گیا تھا۔ اور والدین کو اس کی خدمت کرنے کے بدلے میں نقد قسم کی اُجرت دینے کے لیے ایک شفقت بھری لذت عطا کر دی گئی تھی۔

اور اب جبکہ اُس خالق رحیم نے -جس کے اس بچے میں ہزار میں سے نو سو ننانوے حصے ہیں اور اس کے باپ کا ایک ہی حصہ ہے- رحمت اور حکمت کے تقاضے کے تحت تمہارے ہاتھوں سے لے لیا ہے اور تمہیں تمہاری خدمات سے سبکدوش کر دیا ہے؛ تو اہل ایمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ نا اُمید ہو کر اس انداز سے غم کریں اور آہ وفغاں پر اُتر آئیں کہ جس سے اِس ایک ظاہری حصے کے مقابلے میں ایک ہزار حقیقی حصے کے مالک کے خلاف شکوہ کرنے کا اشارہ ملتا ہو، یہ کام تو صرف گمراہ اور غافل لوگوں کو ہی زیب دیتا ہے۔

**چوتھا نقطہ:** دنیا اگر ہمیشہ رہنے والی ہوتی، اور انسان بھی اس میں ہمیشہ رہنے والا ہوتا تو پھر تو اس نا امیدی سے لبریز افسوس اور دردناک رنج وغم کا کوئی مطلب ہوتا؛ لیکن دنیا چونکہ ایک مہمان خانہ ہے، اس لیے مرنے والا بچہ جہاں بھی گیا ہے ہم اور آپ بھی بہرکیف وہیں جانے والے ہیں۔

پھر یہ وفات صرف اسی بچے کے ساتھ ہی تو خاص نہیں ہے بلکہ یہ تو وہ راستہ ہے جس پر سب چلتے جا رہے ہیں۔

پھر فراق بھی چونکہ ابدی نہیں ہے، بلکہ آئندہ دنوں میں برزخ اور جنّت میں ملاقات ہونے ہی والی ہے؛ اس لیے ہمیں یہ کہنا چاہیے: فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ کا ہے...... صرف اللہ کا ہے جو اس نے لیا اور جو دیا ہے اور ہر حال میں الحمدللہ کہتے ہوئے صبر وشکر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

**پانچواں نقطہ:** شفقت جو کہ رحمتِ الٰہیہ کے لطیف ترین جلووں میں سے ایک نمایاں ترین، خوبصورت ترین، پاکیزہ ترین اور شیریں ترین جلوہ ہے؛ ایک نورانی اکسیر ہے اور عشق سے کہیں زیادہ تیر بہدف اور پُرتاثیر ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا تیز ترین وسیلہ ہے؛ تو جس طرح دنیاوی اور مجازی عشق بہت سی مشکلات سے گزر کر عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اللہ کو پالیتا ہے، اسی طرح شفقت دل کو

اللہ تعالیٰ کے ساتھ باندھ دیتی ہے لیکن مشکلات کے بغیر اور صاف ترین شکل میں اور مختصر ترین راستے کے ذریعے۔

ماں اور باپ دونوں ہی اپنے بچے کے ساتھ اتنی محبت کرتے ہیں کہ اُسے تقسیم کیا جائے تو ساری دنیا کو پوری آجائے۔لیکن جب ان کے ہاتھ سے ان کا بیٹا چھین لیا جاتا ہے تو اگر وہ سعادت مند اور حقیقی ایمان دار ہوں تو دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں اور مُنعمِ حقیقی کو اپنے سامنے پاتے ہیں اور کہتے ہیں: دنیا جب فانی ہے تو پھر اس کے ساتھ دل نہیں لگانا چاہیے، اور یُوں وہ جہاں اس کا بیٹا گیا ہوتا ہے اُسی جگہ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور ایک بلند ترین معنوی حالت حاصل کر لیتا ہے۔

ان پانچ حقائق میں جو سعادت اور خوشخبری پائی جاتی ہے، اہلِ غفلت وضلالت اس سے محروم ہیں۔اور ان کی دردناک حالت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ: ایک بوڑھی ماں جب اپنے محبوب بیٹے کو سکرات کی حالت میں تڑپتا ہوا دیکھتی ہے تو وہ غفلت یا گمراہی کے نتیجے میں اس وہم میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ ہم نے اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے، اسی بنا پر موت کو عدم اور ابدی فراق تصور کرتے ہوئے اس کے ذہن میں نرم وگداز بچھونوں کی بجائے قبر کی مٹی گھوم جاتی ہے۔

اور اب چونکہ غفلت یا گمراہی اُسے اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ کی رحمت کی جنّت اور اس کی نعمت کی فردوس نظر نہیں آنے دیتی، چنانچہ اس بنا پر وہ نا اُمیدی سے بھرے ہوئے رنج وغم سے کس حد تک دوچار ہوسکتی ہے، اس کا تصور آپ خود کر سکتے ہیں۔

لیکن ایمان اور اسلام جو کہ سعادتِ دارین کا وسیلہ ہیں، دونوں ہی مومن آدمی سے کہتے ہیں: تمہارا یہ بیٹا جو نزع کے عالم میں سکرات کی حالت سے دوچار ہے، اس کا خالقِ رحیم عنقریب اسے اِس بدنما دنیا سے نکال کر جنّت کی طرف لے جائے گا اور اسے تمہارے لیے شفاعت کنندہ اور ابدی بیٹا بنا دے گا۔اور غمگین ومضطرب ہونے کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ یہ فراق بالکل عارضی سا ہے۔اس لیے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہتے رہو کہ: "اَلْحُكْمُ لِلّٰهِ... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ"۔

الباقی هو الباقی

سعید نورسی

## دوسرا لمعہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿وَاَيُّوۡبَ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ﴾

بے شک صبر وشکیبائی کے ہیرو سیدنا ایوب علیہ السلام کی یہ مناجات بڑی مجرّب اور مؤثر ہیں۔اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم آیتِ کریمہ سے اقتباس کرتے ہوئے کہیں:

﴿رَبِّ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَأَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ﴾

حضرت ایوب علیہ السلام کے مشہور قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مدتِ مدید تک خارش، پھوڑوں اور زخموں کا تختۂ مشق رہے، لیکن اُنہوں نے بکمال صبر و استقامت اس بیماری کو برداشت کیا اور اس پر پروردگار سے ثوابِ عظیم کی اُمید رکھی۔ پھر جب اُن زخموں سے جنم لینے والے کیڑوں نے آپ کے دل اور زبان کو نقصان پہنچایا تو پھر آپ نے اپنے پروردگار سے مناجات کیں، اپنی استراحت کے لیے نہیں بلکہ اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں آپ کی عبودیت میں خلل نہ آجائے؛ کیونکہ اِن زخموں نے آپ کے دل اور زبان کو متأثر کر دیا تھا جو کہ ذکر اور معرفتِ الٰہیہ کا مقام ہیں۔ چنانچہ آپ نے کہا:

''پروردگار! مجھے بیماری لگ گئی ہے اور یہ میری زبان کے ذکر اور دل کی عبودیت میں خلل انداز ہو رہی ہے۔'' تب اللہ تعالیٰ نے ان کی خالص اور پاک صاف مناجات کو معجزانہ شرف قبولیت بخشا اور اُنہیں مکمل عافیت عطا فرمائی اور اپنی رحمتِ شاملہ کا مظہر بنا دیا۔

☆ یہ لمعہ پانچ نکات پر مشتمل ہے۔

### پہلا نکتہ

حضرت ایوب علیہ السلام کے زخموں اور ظاہری امراض کے مقابلے میں ہم باطنی رُوحانی اور قلبی امراض کا شکار ہیں، چنانچہ اگر ہمارا باطن ظاہر بن جائے اور ظاہر باطن بن جائے تو ہم ایوب علیہ السلام سے کہیں زیادہ زخمی اور بیمار نظر آئیں؛ اس کی وجہ یہ ہے:

ہمارا ہر گناہ اور ہمارے ذہنوں میں جنم لینے والا ہر شُبہ ہمارے قلوب و اَرواح میں زخم چھوڑ جاتا ہے۔ جناب ایوب علیہ السلام کے زخم اُن کی چھوٹی سی زندگی کو ڈراتے دھمکاتے تھے، لیکن ہمارے معنوی زخم ہماری اَبدی اور لمبی زندگی کو دھمکا رہے ہیں۔ اِس لیے ہم اِن ''ایوّبی مناجات'' کے حضرت ایوب علیہ السلام سے ہزار درجہ زیادہ محتاج ہیں۔ اور خاص کر اِس صورت میں کہ جس طرح اُن کے زخموں سے پیدا ہونے والوں کیڑوں نے اُن کے دل اور زبان کو نقصان پہنچا دیا تھا، اِسی طرح گناہوں سے پھوٹنے والے زخم اور ان زخموں سے جنم لینے والے وسوسے اور شکوک وشبہات ہمارے دل کے باطن کو چُھوتے ہیں جو کہ محلّ ایمان ہے اور ایمان کو زخمی کر دیتے ہیں، اور زبان کے روحانی ذوق کو چھوتے ہیں جو کہ ایمان کی ترجمان ہے، چنانچہ اس سے ذکر کی لذت چھین کر اُس کے رُوحانی ذوق کو تہ و بالا کر دیتے ہیں اور اُس کو ذکر الٰہی سے متنفر اور دور کرتے ہوئے کلی طور پر خاموش کر دیتے ہیں:

بلاشبہ گناہ دل میں پوری شدت سے گھس جاتا ہے اور اپنی جڑیں اس کی گہرائی تک لے جاتا ہے اور پھر اس میں سیاہ نقطے لگاتا رہتا ہے، حتی کہ اس سے ایمان کی روشنی کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور اس سے دل تاریک اور ویران ہو جاتا ہے دل میں تاریکی اور ویرانی کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور انتہائی سخت اور کٹھور ہو جاتا ہے؛ کیونکہ ہر گناہ کے اندر سے ایک راستہ نکل کر کُفر تک جاتا ہے، اس لیے اگر اس گناہ کو فوراً استغفار کے ساتھ مٹا نہ دیا جائے تو وہ ایک کیڑے کی طرح نہیں بلکہ ایک چھوٹے سے سانپ کی طرح دل کو ڈس لیتا ہے:

مثال کے طور پر ایک آدمی خفیہ طور پر کسی ایسے گناہ کا اِرتکاب کرتا ہے جو شرمندگی کا باعث ہو، پھر وہ جب دوسروں کو بتانے سے گریز کرتا ہے تو ملائکہ اور دیگر رُوحانی قوّتوں کا وجود اُس کے لیے بوجھ بن جاتا ہے اب ان حالات میں وہ کسی بھی چھوٹی موٹی دلیل سے اُن کے وجود کا اِنکار کرنا چاہتا ہے۔

اور مثال کے طور پر:

ایک آدمی کسی ایسے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جس کا انجام جہنم ہے، تو اگر استغفار کے ذریعے اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں کرے گا تو اُسے جب بھی جہنم سے ڈرایا جائے گا وہ اپنی دل کی گہرائیوں سے جہنم کی نہ ہونے کی خواہش ظاہر کرے گا۔ وہ کسی چھوٹے سے شک وشبہ کے بل پر اُس کے وجود کے انکار کی جرأت کرے گا؛ کیونکہ اُس کی دل کی گہرائیوں سے یہ آرزو ہے کہ جہنم کا وجود نہیں ہونا چاہیے!

اور مثال کے طور پر: ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا اور وظیفۂ عبادت کما حقہ ادا نہیں کرتا ہے، اور وہ اپنی کسی معمولی سی ذمہ داری سے غفلت کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے اپنے معمولی افسر کی معمولی سی ڈانٹ ڈپٹ سے تکلیف محسوس کرتا ہے، اب یہ آدمی خداوندِ کریم کی طرف سے بار بار صادر ہونے والے اوامر کے بارے میں جب اپنے فرائض سے غفلت برتے گا تو یہ غفلت اس کی رُوح میں شدید تنگی پیدا کرے گی، اور یہ تنگی اور تاریکی اس میں انکار کی رغبت پیدا کرے گی جس کی بنا پر وہ جُھجھکتے ہوئے انداز میں کہے گا: ''کاش وہ اس طرح کی عبادت کا حکم نہ دیتا! کاش کہ یہ فریضہ نہ ہوتا! اس کے اس انداز سے انکار کی ایک اس طرح کی تمنّا سر اُٹھاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معنوی عداوت کا پتا دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کے دل میں جب بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں کوئی شبہ جنم لیتا ہے وہ اُس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ایک قطعی دلیل کی طرح اُس کا دامن پکڑ لیتا ہے اور اس کے سامنے ہلاکت کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے لیکن وہ بدبخت یہ نہیں جانتا کہ انکار کی یہ رَوش اختیار کر کے وہ خود کو ایسی تنگی میں ڈال رہا ہے جو اس تنگی سے لاکھوں درجے سخت ہے، یعنی وظیفۂ عبادت کی وجہ سے تو وہ ایک معمولی سی تنگی سے دو چار ہو رہا تھا لیکن اس کا انکار کر کے اس نے لاکھوں قسم کی تنگیاں مول لے لی ہیں، مطلب یہ کہ وہ مکھی کی خراش سے تو بھاگتا ہے لیکن سانپ کے ڈنک پر خوش ہوتا ہے۔ اور یوں ان تین مثالوں پر قیاس کر کے ﴿بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ میں پایا جانے والا راز اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

## دوسرا نکتہ

انسان کو مصائب و امراض میں شکوہ شکایت کرنے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا ہے۔ اس کی تین وجہیں ہیں، جیسے کہ چھبیسویں مقالے، میں ''تقدیر'' کی بحث میں وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔

### پہلی وجہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بدن کا لباس پہنایا ہوا ہے، اس لباس کو وہ اپنی صنعت گری کا مظہر بناتا ہے۔ اور انسان کو اُس نے ماپ بنایا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ اِس لباس کو اُس ماپ کے حساب سے کاٹتا ہے، بنا بریں وہ کبھی اسے چھوٹا کرتا ہے اور کبھی اس میں تبدیلی لاتا ہے، اور یوں اپنے مختلف اسمائے گرامی کے جلووں کو آشکار کرتا ہے۔ پس جس طرح اسم گرامی ''الشافی'' مرض کا تقاضا کرتا ہے اسی طرح اسم ''الرزّاق'' بُھوک کا تقاضا کرتا ہے...... دیگر اسمائے گرامی بھی اسی طرح ہیں۔

فان مالك الملك يتصرف فى ملكه كيف يشاء۔

## دوسری وجہ

زندگی مصائب و امراض کے ذریعے صاف ہوتی ،قوت پکڑتی اور ترقی کرتی ہے، اور مصائب و آلام کے سبب سے ہی پھل دیتی، درجۂ کمال کو پہنچتی اور زندگانی کے وظائف ادا کرتی ہے۔فرشِ راحت پر لیٹی ہوئی ایک ہی ڈِگر پر چلتی ہوئی زندگی وجود جو کہ خیرمحض ہے، سے زیادہ عدم جو کہ شرِّمحض ہے، کے قریب ہے اور اس کی طرف رواں دواں ہے۔

## تیسری وجہ

یہ دارِدنیا امتحان اور عمل کی جگہ ہے۔لذت، اجرت اور مکافات کی جگہ نہیں ہے۔

تو جب دنیا دارِ عمل اور محلِ عبادت ہے تو پھر امراض و مصائب بشرطیکہ وہ دینی نہ ہوں اور ان پر صبر بھی کیا جائے تو یہ اس عمل اور عبادت کے ساتھ مکمل موافقت رکھتے ہیں اور اسے قوت دیتے ہیں اور اس کی ہر گھڑی کو پورے دن کی عبادت کر دیتے ہیں، لہٰذا اس پر شکوے کی بجائے شکر ادا کرنا چاہیے۔

جی ہاں! عبادت کی دو قسمیں ہیں:

مثبت......منفی

مثبت عبادت کے بارے میں سب جانتے ہیں۔لیکن جہاں تک منفی عبادت کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امراض و مصائب میں مبتلا انسان کو جب اپنے ضعف و عجز کا احساس ہوتا ہے تو وہ سراپا التجا بن کر روتا گڑگڑاتا ہوا اپنے ربِّ رحیم کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور یوں اس عمل کے ذریعے وہ خالص عبادت بجالاتا ہے، ایسی خالص کہ جس میں ریاکاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔اِن حالات میں اگر وہ صبر کرے، اپنی اس مصیبت کے ثواب کے بارے میں سوچے اور اس پر سراپا شکر و سپاس بن جائے تو اس صورت میں اس کی ہر گھڑی عبادت کے ایک دن کا حکم لے لے گی اور اس کی چھوٹی سی عمر ایک لمبی عمر کا رُوپ دھار جائے گی۔ بلکہ بعض کے نزدیک تو اس کا ایک منٹ ایک دن کی عبادت کی طرح ہو جائے گا۔

میرا ایک اُخروی بھائی تھا جس کا نام حافظ احمد مہاجر تھا، وہ ایک خطرناک قسم کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میں بہت پریشان رہتا تھا۔ایک دن اچانک میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی:

اُسے خوشخبری دو، اُسے مبارکباد دو؛ کیونکہ اُس کی عمر کا گزرنے والا ایک ایک منٹ ایک ایک دن کی عبادت کا حکم لیتا جا رہا ہے۔ وہ یقیناً سراپا صبر بن کر شکر ادا کیا کرتا تھا۔

## تیسرا نکتہ

ہر انسان جب اپنی گزشتہ زندگی کو یاد کرتا ہے تو اس کے دل اور زبان پر یا تو غم کا ورود ہوتا ہے یا پھر خوشی کا؛ کیونکہ یا تو وہ افسوس کرے گا اور یا کہے گا: الحمدللہ، اب جو چیز اُس سے افسوس کرواتی ہے وہ معنوی آلام ہیں جو کہ گزرے وقت کی لذّتوں کے زوال اور فراق سے پیدا ہوتے ہیں؛ کیونکہ لذت کا زوال اَلم ہے، بلکہ کبھی ایک زوال پذیر لذت دائمی اَلم سے دوچار کر دیتی ہے۔ اور اُس کی یاد اُس اَلم کو کھود کھود کر اس کے اندر سے افسوس کے قطرے ٹپکاتی رہتی ہے۔ جبکہ ایک معنوی دائمی لذت جو کہ انسان کی گزشتہ زندگی کے آلام و مصائب کے زوال سے جنم لیتی ہے، وہ لذت انسان کی زبان سے الحمدللہ کہلواتی ہے جیسے کہ ہم نے ایک دو مقالوں میں اس کی وضاحت کی ہے...... یہ ایک فطری حالت ہے جس کا شعور ہر انسان کو ہے۔ مزید یہ کہ ایک مریض اور دُکھی انسان جب اُس اجر و ثواب کے بارے میں سوچے گا جو اس کے ربِّ کریم نے اُس کے لیے آخرت میں تیار کر رکھا ہے اور جب اِس بارے میں سوچے گا کہ اس مصیبت کی وجہ سے اُس کی چھوٹی سی عمر طویل عمر میں تبدیل ہو گئی ہے، تو اِس پر وہ صبر سے بھی کئی گنا زیادہ شکر ادا کرے گا، اور بہرکیف یہ کہے گا:

الحمد للّٰہ علی کل حال سوی الکفر و الضلال

ایک مشہور مقولہ ہے کہ: ''مصیبت کا زمانہ لمبا ہوتا ہے''۔

جی ہاں! مصیبت کا زمانہ واقعۃً لمبا ہو جاتا ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ اس میں دُکھ درد ہوتا ہے جیسے کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ یہ زمانہ طویل عمر کی طرح زندگی سے بھرپور نتائج و ثمرات عطا کرتا ہے۔

## چوتھا نکتہ

اکیسویں مقالے کے پہلے مقام میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے:

انسان کو اللہ تعالیٰ نے صبر کی جو قوّت عطا کی ہوئی ہے، وہ اس قوّت کو اَوہام کی وادیوں میں پراگندہ نہ کر دے تو یہ اُسے ہر مصیبت کے مقابلے میں کافی ہوسکتی ہے۔لیکن اس پر وہم وغفلت نے اتنے دبیز پردے تان دیے ہیں کہ یہ اس فانی زندگی کو دائمی سمجھتا ہوا اپنی قوّتِ صبر کو ماضی اور مستقبل کی راہوں میں بکھیر دیتا ہے۔ اور یوں حال میں پائی جانے والی مصیبت کے مقابلے میں اِس کے پاس چونکہ کچھ بھی نہیں رہتا ہے، چونکہ صبر کافی نہیں رہتا اس لیے وہ شکوے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ نعوذ باللہ انسان کے سامنے اللہ کی شکایتیں شروع کر دیتا ہے۔

پھر غیر منصفانہ انداز میں پاگلوں کی طرح شکوہ کر کے اپنی بے صبری کا اظہار کرتا ہے، جبکہ جو دن گزر گیا اس کی مصیبت گئی اور راحت باقی رہ گئی، اس کا درد واَلَم گیا اور لذت باقی رہ گئی اور گلوگیری و دلگیری گئی اور اجر وثواب باقی رہ گیا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس حالت سے لذت گیر ہو کر شکر ادا کیا جائے نہ کہ شکوہ شکایت۔ اور یہ بھی ضروری ہوا کہ اُن ایّام کے ساتھ محبت کی جائے نہ کہ اُن پر غصّے اور نفرت کا اظہار کیا جائے؛ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی گزری ہوئی فانی عمر اس مصیبت کی وجہ سے ایک سعادت منداور باقی رہنے والی عمر کا رُوپ دھار جائے گی، اس لیے اُس میں پائے جانے والے مصائب وآلام کے تصوّر میں گم رہنا اور اس وہم کی بنا پر اپنے صبر کا کچھ حصہ ان کی بھینٹ چڑھا دینا پاگل پن ہے۔ رہے آنے والے دن، تو وہ ابھی تک آئے نہیں، اس لیے آنے والے دنوں میں پیش آنے والے مرض اور مصیبت کا تصوّر کر کے بے صبری کا اظہار کرنا اور شکوہ شکایت کرنا حماقت ہے۔ چنانچہ جس طرح یہ بات حماقت بھرا جنون ہوگی کہ ایک انسان محض اس خدشے سے مسلسل کھانا پینا شروع کر دے کہ کل اور پرسوں مجھے بھوک اور پیاس لگے گی، اسی طرح یہ بات بھی سراپا حماقت اور جنون ہوگی کہ انسان کل کلاں آنے والے اُن آلام ومصائب کے بارے میں سوچتا رہے اور اُن سے دُکھ اُٹھاتا رہے؛ اور ان کی وجہ سے پریشان اور مصروفِ آہ وفغاں رہے جن کا آج وجود ہی نہیں ہے۔ ایسی رَوِشِ اختیار کر کے اپنی جان پر بغیر کسی مجبوری کے خود ظلم کرنا ایک ایسی بیوقوفی ہے جس کی وجہ سے ایسا آدمی کسی شفقت ورحمت کا مستحق نہیں رہتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جس طرح شکر نعمت میں اضافے کا باعث بنتا ہے اس طرح شکوہ مصیبت میں

اضافہ کرتا ہے اور ایسے شکایت کے خوگر ناشکرے انسان سے شفقت و رحمت کا استحقاق چھین لیتا ہے۔

شہر میں ایک نیک آدمی کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو گیا۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے پہلے سال کی بات ہے۔ میں اُس کی تیمارداری کے لیے گیا تو اُس نے مجھے کہا: ''پچھلی سو راتوں سے میں تکیے پر سر بھی نہیں رکھ سکا، یعنی بالکل سو نہیں سکا ہوں۔'' اور یوں اُس نے دردناک قسم کا شکوہ کیا۔ مجھے اُس کی اس حالت سے بہت تکلیف ہوئی پھر اچانک میرے دل میں ایک بات آئی اور میں نے اسے کہا:

میرے بھائی! تمہارے گزرے ہوئے درد بھرے سو دن اب خوشی بھرے سو دنوں کے حکم میں ہیں، اس لیے انہیں یاد کر کے حرفِ شکایت زبان پر مت لاؤ بلکہ اُن کے گزر جانے کا شکر ادا کرو۔ رہے آنے والے دِن، تو وہ ابھی آئے نہیں اس لیے ان کے بارے میں اپنے رحمان و رحیم پروردگار کی رحمت پر بھروسہ رکھو۔ مار پڑے بغیر رونے پر آمادہ نہ رہو۔ جو چیز ہے ہی نہیں اُس سے ڈرو نہیں، اور عدم کو وجود کا رنگ نہ دو اور صرف موجودہ گھڑی کو ذہن میں رکھو۔ اور موجودہ گھڑی سے نپٹنے کے لیے تمہاری قوّتِ صبر کافی ہے۔ اور اُس پاگل کمانڈر کا کردار مت ادا کرو جس نے اپنے مرکز کی قوّت کو عین اُس وقت دائیں بائیں منتشر کر دیا جبکہ دشمن کا بایاں دستہ اس کے دائیں دستے سے آملا اور یوں دائیں دستے کی قوّت میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن یہ دایاں دستہ ابھی حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب اس کمانڈر نے یہ کیا کہ اپنے مرکز کی قوّت کو دائیں بائیں بھیج کر مرکز کو کمزور کر دیا دشمن نے اس صورتحال سے فائدہ اُٹھایا اور معمولی سے حملے کے ساتھ اس کے مرکز کو تہس نہس کر دیا۔

اس لیے تم اے میرے بھائی، اس کمانڈر جیسے مت بنو، اپنی تمام قوّت کو لمحۂ موجود کے لیے جمع کرو اور اللہ کی رحمت اور آخرت کے اجر کو نگاہ میں رکھو، اور یہ بات ذہن نشیں کر لو کہ تمہارا یہ مرض تمہاری چھوٹی سی اور فانی عمر کو ایک لمبی اور باقی عمر میں تبدیل کر دیتا ہے؛ اس لیے اس دَرد بھرے شکوے شکایت کی بجائے خوشی کا اِظہار کرتے ہوئے باری تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

میری اس گفتگو سے وہ آدمی بہت خوش ہوا اور کہنے لگا: الحمدللہ، میرا مرض صرف دس حصوں میں سے گِر کر ایک حصہ رہ گیا ہے۔

# پانچواں نکتہ

اس میں تین مسائل ہیں۔

## پہلا مسئلہ

اصل اور نقصان دہ مصیبت وہ ہے جو دین کو پہنچے۔ اس لیے باری تعالیٰ کی چوکھٹ پر پناہ لے کر اُس دین کو نقصان دینے والی مصیبت سے محفوظ رہنے کی ہمیشہ دعا مانگنی چاہیے۔ رہے وہ مصائب جو کہ دین کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتے، تو وہ حقیقت کی نظر میں مصائب نہیں ہوتے، اُن میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو رحمانی تنبیہ وفہمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ جس طرح ایک چرواہا کسی دوسرے کے کھیت میں گھس جانے والی بکری کو پتھر مارتا ہے تو بکری سمجھ جاتی ہے کہ یہ پتھر مجھے خطرے سے آگاہ کرنے اور نقصان سے بچانے کے لیے آیا ہے، اور وہ راضی خوشی اپنی چراگاہ میں واپس آجاتی ہے؛ اِسی طرح بہت سے ظاہری مصائب ہیں، جو کہ دراصل الٰہی تنبیہات ہیں۔

اور کچھ مصائب اُن میں سے وہ ہیں جو کہ گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں۔

اور کچھ وہ ہیں جو آ کر انسان کو غفلت سے بیدار کرتے ہیں اور اسے انسانی ضعف وعجز کا شعور دے کر ایک قسم کا شعور بخشتے ہیں۔

رہا وہ مرض جو کہ مصیبت کی ایک قسم ہے، تو اِس طرح کا مرض مصیبت نہیں بلکہ یہ التفاتِ رحمانی اور تطہیر ہے جیسے کہ ایک حدیث بھی ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے: بخار کی کپکپاہٹ سے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں جیسے کہ درخت کو ہلانے سے پکے ہوئے پھل گر جاتے ہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ سیدنا ایوب علیہ السلام نے اپنی مناجات میں خود اپنی ذات کی راحت وراَمش کے لیے نہیں پکارا تھا، بلکہ جب نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ مرض ذکرِ لسان وفکرِ قلب کے لیے رُکاوٹ بن گیا تو اُنہوں نے وظیفۂ عبودیت کی خاطر شفا کے لیے دعا کی۔ پس ہمیں اس مناجات کے ذریعے اپنے گناہوں سے جنم لینے والے معنوی اور رُوحانی زخموں کے لیے شفا کی نیت سے دعا مانگنی چاہیے۔ اور ہمارا اوّلین مقصد یہی ہے اور ہمیں اپنے مادی امراض کے لیے بھی جب کہ وہ عبادت کے آگے رکاوٹ بن

جائیں ڈاللہ کے حضور گریہ زاری کرنی چاہیے۔لیکن یہ گریہ وزاری اعتراض اور شکوہ شکایت کے انداز میں نہیں ہونی چاہیے، بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار کرتے ہوئے اور مدد طلبی کے انداز میں اس کی پناہ میں آجائیں؛ کیونکہ جب ہم اس کی ربوبیت پر راضی ہیں تو پھر اس ربوبیت کی جہت سے وہ ہمیں جو کچھ بھی دے ہمیں اُس پر راضی رہنا چاہیے۔لیکن ایسے انداز سے شکوہ شکایت اور آہ وزاری کرنا جس سے اُس کی قضاوقدر پر اعتراض کا پہلو نمایاں ہوتا ہو، یہ انداز تقدیر پر تنقید اور رحمت پر تہمت زنی کے مترادف ہے۔ جو تقدیر پر تنقید کرے گا وہ اپنا سر آہرن پر مار مار کر پھوڑ لے گا۔ اور جو رحمت کو الزام دے گا وہ باری تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جائے گا۔ چنانچہ جس طرح ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو اگر انتقام لینے کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ مزید ٹوٹے گا، اسی طرح مصیبت میں مبتلا انسان اگر مصیبت کے مقابلے میں غم، شکوہ، شکایت اور اعتراض اور قلق و اضطراب کرے گا تو مصیبت کو دوگنا کر بیٹھے گا۔

**دُوسرا مسئلہ**

انسان جب بھی کسی مادی مصیبت کو بڑا سمجھے گا وہ بڑی ہو جائے گی اور جب بھی اسے چھوٹا سمجھے گا وہ چھوٹی ہو جائے گی، مثال کے طور پر: رات کے وقت آنکھ کے ساتھ چھُو جانے والے کسی خیال پر انسان اگر زیادہ توجہ دے گا تو وہ پھیلتا جائے گا اور اگر اس کی طرف مطلق توجہ نہیں دے گا تو وہ غائب ہو جائے گا۔ اور جیسے کہ اگر وہ شہد کی مکھیوں کو چھیڑے گا تو وہ اس پر زیادہ شدت سے حملہ کر دیں گی، اور اگر اُن سے پرے ہٹ جائے گا تو وہ متفرق ہو جائیں گی۔

یہی صورتِ حال ان مادی آلام و مصائب کی ہے، کہ انسان اگر اِن کو زیادہ اہمیت دے گا اور انہیں بڑا سمجھے گا تو وہ بڑے ہوتے جائیں گے اور غم واندوہ کی وجہ سے بڑھتے بڑھتے جسم سے آگے بڑھ کر اپنی جڑیں دل میں مضبوط کر لیں گے اور وہاں معنوی مصیبت کی نشوونما کریں گے اور پھر اِس معنوی مصیبت کو اپنا مرکز بنا کر طول پکڑتے جائیں گے۔

لیکن انسان جب اس غم واندوہ اور قلق و اضطراب کو توکّل اور رضا بالقضا کا سہارا لے کر پرے ہٹا دے گا تو یہ مادی مصیبت دھیرے دھیرے ہلکی پڑ جائے گی، بالکل اُس درخت کی طرح کہ جس کی

جڑیں کاٹ دی جائیں تو وہ دھیرے دھیرے سوکھ کر ختم ہو جائے گا ڈ میں نے ایک دن اس حقیقت کی ترجمانی ان الفاظ کے ساتھ کی تھی:

ارے مسکین! چیخ و پکار چھوڑ،

مصیبت میں اللہ پر بھروسہ رکھ۔

یاد رکھ کہ، چیخ و پکار بلا در بلا در خطا ہے۔

اگر تجھے وہ مل جائے جس نے تجھے مبتلائے مصیبت کیا ہے تو یاد رکھ کہ، پھر یہ مصیبت بلا دَر صفا ہے ڈصفا دَر عطا ہے۔

تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تُو چھوٹی سی مصیبت پر مصروف آہ و فغاں ہے جبکہ تیرے سر پر تو پوری دنیا کے برابر مصیبتیں ہیں۔

اس لیے آ توکّل کر۔

توکل کی مدد سے مصیبت کا سامنا کر کے مسکرایا کرتا کہ خود مصیبت بھی مسکرا دے ڈ کیونکہ مصیبت جُوں جُوں مسکرائے گی چھوٹی ہوتی چلی جائے گی اور تبدیل ہوتی جائے گی۔

جس طرح ہنسنے کے طفیل باہمی عداوت مصالحت کا رُوپ دھار جاتی ہے اور جھگڑا مزاح کا رنگ اختیار کر جاتا ہے ڈ اور خوفناک دشمن کے سامنے مسکراہٹ سے ظلم و زیادتی کمزور ہوتی ہوتی بالآخر منعدم ہو جاتی ہے ڈ مصیبت کے سامنے بھی یہی رویہ اختیار کر کے اور توکل کا ہاتھ پکڑ کر اس کے دائرے سے باہر نکلا جائے گا۔

## تیسرا مسئلہ

ہر دور کا اپنا ایک علیحدہ حکم ہوتا ہے، چنانچہ غفلت کے اس دور میں مصیبت نے اپنی شکل و صورت تبدیل کر لی ہے، مطلب یہ کہ بعض اوقات اور بعض لوگوں کے ہاں مصیبت مصیبت نہیں بلکہ لطفِ اِلٰہی ہوتی ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس دور میں مریض بڑے خوش بخت ہیں، بشرطیکہ یہ مصیبت دین کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو مصیبت میرے ذہن میں کوئی ایسی سوچ پیدا کرتی ہے جو مرض یا مصیبت کے لیے مخالفانہ رویہ رکھتی ہو، اور نہ ہی کسی مریض یا مصیبت زدہ کو دیکھ کر مجھے دُکھ درد کا احساس

ہوتا ہے۔ چنانچہ میرے پاس جو بھی نوجوان مریض آتا ہے میں اس کے بارے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اپنے جیسے دوسرے نوجوانوں کی بہ نسبت دین کے ساتھ زیادہ مضبوط بندھن سے بندھا ہوا ہے اور اس کا دل آخرت کے ساتھ اُن سے زیادہ جُڑا ہوا ہے ڈاس سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اس قسم کی بیماری ایسے لوگوں کے حق میں کوئی مصیبت نہیں بلکہ نعمتِ الٰہیہ کی ایک قسم ہے؛ کیونکہ اس بیماری نے اگرچہ بظاہر اُس کی چھوٹی سی اور فانی زندگی کو مبتلائے مشقّت کر دیا ہے لیکن یہ بات بھی یقینی ہے کہ وہ اُس کی ابدی زندگی کے لیے سُودمند ثابت ہوگی اور ایک قسم کی عبادت کے حکم میں آجائے گی۔

جی ہاں! یہ بات عین ممکن ہے کہ یہ نوجوان اگر صحت و عافیت سے بہرہ وَر ہوتا تو اُن اُمور کا التزام نہ کر سکتا جن کا حالتِ مرض میں کر رہا ہے، بلکہ جوانی کی سرمستیوں میں اور زمانے کی ناہمواریوں میں کھو کر نفسانی خواہشات کی رَو میں بہہ جاتا!

# خاتمہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی لامحدود قدرت اور لاانتہا رحمت کے اظہار کے لیے انسان کی ماہیت میں لامحدود عجز اور نہ ختم ہونے والا فقر رکھ دیا ہے۔

اِسی طرح اُس انسان کو اپنے لامحدود نقوش و اسماء کے اظہار کے لیے ایک مشین کی طرح پیدا کیا ہے، چنانچہ یہ لامحدود جہتوں سے لذّت اُٹھاتا ہے اور اِسی طرح لاانتہا جہتوں سے دُکھ پاتا ہے۔ اور اس انسانی مشینری میں سینکڑوں آلات پائے جاتے ہیں اور ہر آلے کا ایک علیٰحدہ دُکھ ہے، علیٰحدہ لذت ہے، علیٰحدہ عمل ہے اور علیٰحدہ جزا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اَسمائے الٰہیہ جو کہ انسانِ اکبر یعنی کائنات میں تجلّی ریز ہیں اُن اسماء کے جلوے انسان کے اندر بھی جگمگا رہے ہیں جو کہ عالَمِ اصغر ہے۔

اس عالَمِ اصغر یعنی انسان میں پائے جانے والے تمام نفع بخش اُمور جیسے صحت و عافیت ولذّات وغیرہ اِسے آمادۂ شکر کرتے ہیں اور اس مشینری کو بہت سی جہتوں سے متعدد کام لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس سے انسان شکر کی ایک چھوٹی سی فیکٹری کا رُوپ دھار جاتا ہے، اِسی طرح باری تعالیٰ مصائب، بیماریوں اور آلام اور حرکت دینے والے دیگر عوارض کے ذریعے اسی مشین کے دیگر پہیوں کو بھی متحرک کر دیتا ہے اور اس طرح ماہیت انسانی میں مندرج عجز، ضعف وفقر کی معدنیات کو کام میں لاتا ہے۔ چنانچہ یہ آلام و مصائب انسان کو صرف ایک زبان سے نہیں بلکہ تمام اعضاء کی زبانوں سے بارگاہِ خداوندی میں پناہ خواہی اور مدد کی صورت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ گویا کہ انسان ان عوارض و مصائب میں ایک ایسے متحرک قلم کا رُوپ دھار جاتا ہے جس کے دامن میں ہزاروں مختلف قلم پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ انسان اس کے ساتھ اپنے صحیفۂ حیات میں یا لوحِ مثال میں اپنی زندگی کے مقدّرات کو رقم کرتا رہتا ہے اور اُن سے اسمائے الٰہیہ کے اعلان و اظہار کی لوحیں تیار کرتا رہتا ہے۔ اور یوں انسان ایک سبحانی منظوم قصیدہ بن جاتا ہے اور اپنی فطرت کا وظیفہ ادا کرتا رہتا ہے۔